حقیقتِ شرک

مولانا امین احسن اصلاحی

حقیقتِ شرک

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

مطبوعات ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۵۲۹

نام کتاب	:	حقیقت شرک
مصنف	:	مولانا امین احسن اصلاحی
صفحات	:	۱۵۲
اشاعت		
ساتواں ایڈیشن	:	مئی ۲۰۱۹ء
تعداد	:	۱۱۰۰
قیمت	:	**-/۱۱۴ روپے**
ناشر	:	**مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز**

ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵
فون: ۲۶۹۸۱۶۵۲، ۲۶۹۸۴۳۴۷
E-mail: mmipublishers@gmail.com
Website: www.mmipublishers.net

مطبوعہ : Vinayak Offset, Okhla-II, New Delhi-20

ISBN 81-8088-242-X

HAQEEQAT-E-SHIRK (Urdu)
By:Maulana Ameen Ahsan Islahi
Pages:152
Price: ₹114.00

E-mail: info@mmipublishers.net آرڈر کے لیے رابطہ کریں
Customer Care No: 7290092403

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

اسلام کی اساس کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ یہ رسالہ اس کلمہ کے پہلے ٹکڑے لَآ اِلٰہَ کی شرح ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ توحید کیا نہیں ہے۔ شرک کی حقیقت، اس کی قسمیں، اس کی خرابیاں اور انسانی فطرت سے اس کی نامناسبت اس رسالہ سے پوری طرح واضح ہو جائے گی۔ توحید کے دلائل کی تفصیل ہم نے اس رسالہ میں نہیں کی ہے۔ اس کے لیے ہم نے دوسرا رسالہ لکھا ہے، جس کا نام 'حقیقت توحید' ہے۔ اور وہ گویا اِلَّا اللّٰہُ کی شرح ہے۔

اِس سلسلے کا تیسرا رسالہ ''حقیقتِ رسالت'' ہوگا، جس میں توحید اور رسالت کے باہمی تعلق کی وضاحت کے بعد رِسالت سے متعلق مسائل پر پہلے ایک عام بحث ہوگی۔ اس کے بعد آں حضرت ﷺ کی رسالت کے دلائل اور اس کی خصوصیات کی خالص قرآن کی روشنی میں وضاحت کی جائے گی۔ یہ رسالہ کلمۂ طیبہ کے دوسرے جز و یعنی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی تفسیر ہوگا۔

اس رسالہ کی تالیف اہل قلم کے عام طریقہ کے مطابق نہیں ہوئی ہے کہ ایک عنوان سامنے آیا ہو اور محض ظاہری مناسبت کو سامنے رکھ کر اس سے متعلق کچھ آیتیں قرآن سے یکجا کر لی گئی ہوں اور کچھ مواد ادھر ادھر سے اکٹھا کر لیا گیا ہو اور پھر اس سارے مواد کو جمع کر کے ایک کتاب بنا دی گئی ہو۔ بلکہ اس رسالہ میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، تدبر قرآن کے سلسلے میں، میں نے ان کو بار بار جانچا پرکھا ہے، بار بار ان کے ضعف وقوت کا امتحان کیا ہے اور برسوں کی تنقید و تنقیح کے بعد اس خیال سے ان کو ٹانک رکھا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوگی تفسیر قرآن میں جو میرے پیشِ نظر ہے یہ اپنے اپنے مواقع میں بیان ہوں گے۔

ان ہی معلومات کا کچھ حصہ اس رسالہ میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا

ہے۔ تاہم مجھے اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے سب ٹھیک ہی ہے ہوسکتا ہے، کہ مجھ سے لغزشیں ہوئی ہوں۔ پس جو اصحابِ علم کسی لغزش پر مجھے متنبہ فرمائیں گے، میں نہایت مسرت اور کشادہ دلی کے ساتھ ان کی تنبیہات کا خیر مقدم کروں گا۔

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے شرک کی تعریف اور اس کی اصولی قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ اس کے بعد علی الترتیب قرآن کے اول میں مخاطب گروہوں یعنی مشرکین، اہل کتاب اور منافقین کے اندر قرآن نے جن اقسامِ شرک کی نشان دہی کی ہے۔ ان کی وضاحت کی گئی ہے تاکہ لا الٰہ کی نفی میں جو تفصیل پوشیدہ ہے اس کی پوری حقیقت ایک موزوں تدریج کے ساتھ لوگوں کے سامنے آجائے اس کے بعد ان فصلوں کا خلاصہ یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ بیک نظر بحث کے سارے مطالب پڑھنے والے کی گرفت میں آجائیں۔ پھر دو علیحدہ علیحدہ فصلوں میں موجودہ دنیا اور مسلمانوں کے موجودہ حالات کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہوسکے کہ توحید اور شرک کے نقطۂ نظر سے اس وقت دنیا کا کیا حال ہے؟ اس کے بعد وقت کا اصلی فرض بتایا گیا ہے اور زمانے کے خاص حالات کی وجہ سے جو بعض سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے جواب دیے گئے ہیں۔ کتاب کے پچھلے مباحث کو پڑھتا ہوا جو شخص اس فصل تک پہنچے گا اس کے ذہن میں جو اہم شبہات پیدا ہوسکتے ہیں ان کے ازالہ کا حتی الامکان میں نے سامان کر دیا ہے۔ لیکن بعض ضمنی شبہات اور بھی پیدا ہوسکتے ہیں، جن سے میں نے اغماض کیا ہے۔ نیک نیت قارئین خود ان کا جواب معلوم کرلیں گے۔

آخر میں دو فصلیں ”کیا شرک تقاضائے فطرت ہے؟“ اور ”شرک کا اصلی سبب“ کے عنوانوں سے آئیں گی۔ ان میں علمائے ارتقاء سے تعرض کیا گیا ہے، جنھوں نے اپنے زعم کے مطابق شرک کی حمایت میں علمی دلائل فراہم کیے ہیں۔ ان فصلوں میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شرک انسانی فطرت سے بالکل بے جوڑ ہے۔ دین فطرت صرف توحید ہے۔ ان فصلوں سے مقصود ایک طرف تو مقصد دعوت کو تقویت پہنچانا ہے کہ شرک اپنے عالمگیر غلبہ کے باوجود گھورے پر اُگا ہوا ایک درخت ہے، جو توحید کی ایک ضرب کی بھی تاب نہیں لا سکتا۔ بشرطے کہ وہ گروہ جس کو اللہ تعالیٰ نے توحید کو قائم کرنے کے لیے برپا کیا تھا۔ اپنے فرض کو پہنچانے اور شرک کے عام غلبہ کو دیکھ کر اس کے مقابلہ سے ہمت نہ ہار بیٹھے۔

وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ○ (ابراہیم:۲۶)

''خبیث کلمہ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک فاسد پودا ہو جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے، اس کی کوئی جڑ نہ ہو۔''

دوسری طرف عام بنی نوعِ آدم پر یہ واضح کرنا ہے کہ صحیح دعویٰ صرف قرآن کا ہے، جو کہتا ہے کہ انسان کی فطرت توحید ہے، شرک کی غلط فہمی اس کو محض سوءِ فہم اور دوسری کمزوریوں کی وجہ سے لاحق ہو جاتی ہے۔

یہ مقالہ محض علمی تحقیق نہیں ہے بلکہ ایک عظیم مقصد کے لیے دعوت کے ساتھ ساتھ وقت کے نظام اور وقت کی سوسائٹی پر تنقید بھی ہے۔ علمی تحقیقات کو بعض لوگ خاموشی سے پڑھ لیتے ہیں۔ بعض اس کی تحسین کرتے ہیں۔ بعض اس کو مہمل قرار دیتے ہیں۔ اور بعض یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ان باتوں کو ہم بھی جانتے ہیں۔ لیکن وقت کے نظام اور سوسائٹی پر تنقید سے بہت سے لوگ آزردہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان کی یہ آزردگی غصہ و غضب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مجھے تنقید کے جرم کا اقرار ہے اور اس کے لیے صفائی پیش کرنا فضول سمجھتا ہوں۔ لیکن میری نیت نیک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہوں کہ اگر میرے قلم سے حق نکلا ہے تو اس کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے اور اس کے اجر و ثواب میں ان تمام دوستوں کو شریک کرے، جو اس رسالہ کے لکھنے کے محرک ہوئے اور اگر میرا قلم کہیں چوکا ہے تو اس کے اثر کو مٹا دے اور سب کو اس کے گناہ سے بچا لے۔

(امین احسن اصلاحی)

تمہید

شرک کی معصیت دوسری تمام معصیتوں کے مقابل میں ایسی سخت وشدید ہے کہ کوئی مسلمان اس کی ادنیٰ نسبت بھی اپنی طرف گوارا نہیں کرتا۔ ایک عامی سے عامی مسلمان بھی ہر قسم کے الزامات سہہ لے گا، ہر قسم کی معصیتوں کی نسبت اپنی طرف گوارا کرلے گا، ہر طرح کی آلودگیوں اور ہر قسم کے گناہوں کا اعتراف کرلے گا لیکن اگر آپ اس کے کسی عقیدہ یا عمل میں کسی معمولی شائبہ شرک کی بھی نشان دہی کیجیے گا تو تلملا اٹھے گا۔

موجودہ زمانے میں جو لوگ جدید علوم وافکار سے متاثر ہیں، ان کا ذہین طبقہ بھی بلا امتیاز مذہب وملت شرک سے بیزاری ضرور رکھتا ہے، خواہ توحید کے لیے اس کے اندر کوئی حمیت ہو یا نہ ہو۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اس زمانہ میں الحاد ہے یا توحید، شرک جیسی وہم پرستی میں اس زمانے کا عقلیت پرست انسان مبتلا نہیں ہوسکتا اور ان میں سے ہرگز کوئی شخص اس بات کا روادار نہ ہوگا کہ آپ اس کی طرف شرک کی نسبت کریں۔

ایک آدمی جس کے پاس قرآن وحدیث کا کچھ علم ہو، جب شرک سے لوگوں کی اس بیزاری ونفرت کو دیکھتا ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں کے اعمال وعقائد اور دنیا کے عام احوال و معاملات پر غور کرتا ہے تو اس پر سخت حیرت سی چھا جاتی ہے۔ وہ اپنے علم اور لوگوں کی شہادت میں کھلا ہوا تضاد پاتا ہے۔ وہ اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ گوشہ گوشہ میں شرک کی نجاست پھیلی ہوئی ہے، لیکن دوسروں کو اس بات پر متفق اللفظ پاتا ہے کہ دنیا اب اس نجاست سے پاک ہوچکی ہے اور اگر اس کا کچھ نشان باقی ہے تو ایسی ناقابل ذکر اور غیر موثر حالت میں ہے کہ اس کے لیے چنداں فکر واہتمام کی حاجت نہیں ہے، زمانے کی ترقی اور علم کی وسعت سے وہ آپ سے آپ مٹ جائے گا۔ اپنی رائے کی مخالفت میں دوسروں کا یہ اتفاق کلمہ ایک نیک نیت

آدمی کو مشتبہ کر دیتا ہے اور وہ بسا اوقات اپنے علم کو متہم کرنے لگ جاتا ہے کہ ممکن ہے میں نے ہی شرک کا مفہوم غلط سمجھا ہو۔ ممکن ہے توحید کی تعریف میں اصل حقیقت سے میں ہی دور جا پڑا ہوں، کمرے میں بدبو تو ضرور ہے لیکن جب سب یہی کہہ رہے ہیں کہ ہر طرف خوش بو ہی خوش بو پھیل رہی ہے تو ہو نہ ہو اس وقت کچھ میرا ہی دماغ گڑ بڑ ہے۔ یہ چیز کچھ دیر کے لیے اس کو مذبذب اور متردد کر دیتی ہے لیکن جب بار بار کے تجربے کے بعد بھی اسے اپنی ہی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے اور بدبو کے وجود سے انکار کرنا اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے تو اس وقت دو ہی راہیں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ اگر رائے عام کی مخالفت کی جرأت اس میں نہیں ہے تو وہ مجبور ہوتا ہے کہ دوسروں کی طرح خود بھی بدبو کو خوش بو کہنے لگے اور اگر رائے عام کی پروا اتنی نہیں ہے کہ اس کی خاطر حق کو جھٹلائے تو وہ اپنی قوت شامہ کی تصدیق کرتا ہے۔ اور دوسروں کو یا تو صاف صاف خبردار کر دیتا ہے کہ وہ کسی مصلحت سے بدبو کو خوشبو کہہ رہے ہیں یا یہ خیال کرتا کہ ان کو خوشبو اور بدبو میں صحیح امتیاز ہی نہیں ہے۔

میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں اور دوسری مدعی توحید جماعتوں کے بارے میں یہی آخری رائے رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے اندر شرک سے جو بیزاری اور توحید کے لیے جو عصبیت ہے اس کے پیچھے کوئی صحیح علم و شعور نہیں ہے۔ محض ایک پندار ہے، جو ان کی مذہبی و تاریخی روایات کے توارث پر قائم ہے، وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ابطالِ شرک کی ایسی شان دار تاریخ رکھتے ہیں کیسے ہو سکتا ہے کہ اسی باطل میں خود مبتلا ہو جائیں؟ مسلمانوں کے سوا جو دوسری جماعتیں توحید کی مدعی ہیں، ان کے نزدیک شرک سے بیزاری اور توحید کی حمایت ایک علمی تفاخر کے قسم کی چیز ہے، جس طرح کوپرنیکس نے قدیم خیال کے خلاف دعویٰ کیا کہ زمین کی حرکت کا مرکز سورج ہے۔ اور گلیلیو نے دوربین ایجاد کر کے اس دعوے کو حقیقت ثابت کر دیا، اسی طرح جدید تجربات و مشاہدات نے ان لوگوں کے خیال میں شرک کی تمام وہم پرستیوں کو مٹا دیا ہے اور علم و تحقیق کے اس دور میں اب ان میں گرفتار ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ ان لوگوں کو کچھ خبر نہیں کہ شرک فی الحقیقت ہے کیا؟ اس کی صورتیں اور قسمیں کیا کیا ہیں؟ ہماری علمی، اخلاقی اور سیاسی زندگی پر اس کے کیا کیا اثرات پڑتے ہیں؟ ان میں سے وہ کسی ایسی بات سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک اس معاملے کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی

ایک علمی غلطی تھی، جس کی علم انسانی کی ترقی نے اصلاح کردی۔ شرک کا ایک بہت ہی تنگ مفہوم "بت پرستی" یا "نیچر پرستی" ان کے ذہن میں ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ جب نیچر کے اتنے اسرار منکشف ہوچکے ہیں کہ قریب ہے انسان زمین وآسمان اور زمان ومکان کے خداوند ہونے کا دعویٰ کرسکے تو دریاؤں، پہاڑوں، سیاروں اور ستاروں کی بندگی کے کیا معنی!

یہ صورتِ حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک حکیمانہ بات یاد دلاتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ سے کسی شخص کی نیکی کی تعریف کی گئی کہ وہ تو اس قدر نیک ہے کہ بدی کو جانتا بھی نہیں۔ آپ نے اس کی یہ تعریف سن کر فرمایا، تب تو اس کے بدی میں پڑ جانے کا بڑا احتمال ہے۔ کیوں کہ جو شخص بدی اور نیکی میں امتیاز ہی نہیں کرسکتا وہ ہر وقت بدی میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ٹھیک یہی حال ابنائے زمانہ کا ہے۔ یہ لوگ دین سے اس قدر بے خبر ہیں کہ دنیا کی اس سب سے بڑی برائی سے، جس کا نام شرک ہے، اچھی طرح واقف ہی نہیں ہیں اور جو شخص بیماری کو بیماری جانتا ہی نہ ہو وہ اگر بیماری کا کچھ اندازہ نہ کرسکے یا بیماری ہی کو صحت خیال کرنے لگے تو کیا تعجب!
پس وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت ہے کہ اس جاہلیت کی، جس کو قرآن نے ظلمِ عظیم کہا ہے، تشریح کی جائے تاکہ توحید کی صحیح حقیقت اجاگر ہو اور حق وباطل کے یہ دونوں نقطے اس قدر نمایاں ہوجائیں کہ التباس کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّ یَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ

(الانفال: ۴۲)

"تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہو وہ اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جسے ایمان کی زندگی حاصل کرنی ہو وہ دلیل کے ساتھ زندگی حاصل کرے۔"

شرک کی حقیقت اور اس کے اقسام

کسی شے کا صحیح تصور اس کی صحیح تعریف کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، اس وجہ سے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم شرک کی تعریف کریں اور اس کے بعد اس کے اقسام و فروع پر بحث کریں۔

قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ میں جن چیزوں کو شرک قرار دیا گیا ہے، ان کو سامنے رکھ کر، اگر شرک کی تعریف کی جائے تو اس کی تعریف یہ ہوگی۔

> ''خدا کی ذات یا اس کی صفات میں، جس مفہوم میں وہ خدا کے لیے مستعمل ہیں، یا اس کے حقوق میں کسی کو ساجھی ٹھیرانا۔''

اس تعریف کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے کسی قدر توضیح کی ضرورت ہے، خدا کی ذات میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کو کسی سے یا کسی کو خدا سے قرار دینا، کسی کو اس کی ذات برادری سمجھنا، کسی کو اس کا باپ یا بیٹا کہنا مثلاً عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مسیحؑ خدا کے جوہر سے ہیں، یا خدا نے ان کو جنا ہے، یا حضرت مریمؑ خدا کی ماں ہیں۔ یا عربوں کا یہ عقیدہ ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ یہ ساری باتیں خدا کے ازلی اور ابدی ہونے اور ان تمام صفاتِ کمال کے منافی ہیں جن کا ماننا عقل، فطرت اور مذہب کی رو سے لازم ہے۔ یہ شرک فی الذات ہے۔(۱)

صفات میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ جو صفاتِ کمال خدا کے لیے مخصوص ہیں۔ مثلاً خلق، تدبیر، قدرت، علم اور حکمت وغیرہ، ان میں کسی کو ساجھی قرار دینا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ

---

(۱) عقیدہ وحدۃ الوجود کی تقریر مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ اس کی بعض صورتیں بالکل اس کے تحت آجاتی ہیں۔ بالخصوص جس صورت میں گیتا اور ہندو فلسفہ میں ہے اس کے شرک فی الذات ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔

قید لگی ہوئی ہے کہ جس مفہوم میں وہ خدا کے لیے مستعمل ہیں، اس قید کا فائدہ یہ ہے کہ یہی صفتیں بسا اوقات ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جب ہم ان کو خدا کے لیے بولتے ہیں تو ان کا مفہوم بالکل خاص ہوتا ہے، جو اس لیے ہمہ و باہمہ ذات کے مناسب ہوتا ہے اور جب ان کو انسانوں کے لیے بولتے ہیں تو خدائی مفہوم سے ان کو بالکل الگ کر کے بولتے ہیں۔ مثلاً حکیم کی صفت ہم خدا اور آدمی دونوں کے لیے بولتے ہیں۔ لیکن جب اس کو خدا کے لیے بولتے ہیں تو اس کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ اگر انسان کے لیے بھی اسی صفت کو اسی مفہوم میں بول دیں، جس مفہوم میں خدا کے لیے بولتے ہیں تو یہ شرک فی الصفات ہوگا۔

حقوق میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کی صفاتِ کمال سے جو باتیں لازم آتی ہیں یا جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں ان میں کسی کو شریک ٹھیرانا۔ مثلاً خدا خالق ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ تمام عالم میں حکم و انتظام اسی کا ہو۔ اب اگر فرض کیجیے ہم یہ تو مانیں کہ آسمان و زمین کا خالق خدا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی مان لیں کہ ان کا انتظام خدا کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں ہے تو یہ شرک فی اللوازم ہوگا۔ اس لیے کہ خدا کے خالق ہونے سے جو بات لازم آتی ہے۔ اس میں ہم خدا کے سوا ایک دوسرے کو شریک کر رہے ہیں۔ حالاں کہ جس نے خلق کیا ہے، امر کا حق دار بھی وہی ہے۔ چناں چہ فرمایا ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف: ۵۴)

”آگاہ اسی کے اختیار میں ہے خلق اور تدبیر۔“

اسی طرح جب تمام کائنات کی تدبیر امر اسی کے ہاتھ میں ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ بندگی صرف اسی کی کی جائے۔ اطاعت خالص اسی کی ہو، محبتِ حقیقی کا مرکز وہی ہو۔ اب فرض کر لیجیے کہ ہم خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کو بھی اختیار کر لیں، یا اس کی اطاعت کے خلاف کسی اور کی اطاعت کو جائز قرار دے لیں یا اس کی محبت کے خلاف کسی اور کو محبت حقیقی کا مرکز ٹھہرا لیں تو یہ ساری باتیں شرک فی الحقوق میں شمار ہوں گی۔ چناں چہ اسی بنیاد پر قرآن نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ:

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ○ (الزمر: ۲)

”اللہ کی بندگی کرو اطاعت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔“

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (البقرۃ:۱۶۵)

"جولوگ اہلِ ایمان ہیں وہ اللہ کی محبت میں دوسری تمام محبتوں سے زیادہ سخت ہوتے ہیں (یعنی دوسروں کے ساتھ ان کی محبت خدا کی محبت کے تحت ہوتی ہے)۔"

یہ شرک کی اصلی قسمیں ہوئیں۔ان کے علاوہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اگرچہ فی نفسہٖ شرک نہیں ہیں اور ان اقسام میں سے کسی کے تحت وہ نہیں آتی ہیں۔لیکن وہ صورتِ شرک یا ذریعۂ شرک ہیں، اگر ان کو باقی رکھا جائے تو اس کا اندیشہ ہے کہ وہ اصلی شرک کا دروازہ کھول دیں گی اور اسلامی شریعت کا اصول یہ ہے کہ وہ گناہ کے ساتھ ساتھ ان ذرائع کا بھی سدباب کرتی ہے، جو اس گناہ کے محرک ہوتے ہیں۔اس وجہ سے شریعت نے ان کو بھی ناجائز قرار دے دیا۔مثلاً غیر اللہ کو سجدہ کرنا، یا بہ قصدِ تعظیم غیر اللہ کی قسم کھانا۔چوں کہ سجدہ ہمیشہ سے انتہائی تذلیل کی نشانی خیال کیا گیا ہے۔اور مشرک قومیں اپنے معبودوں کو سجدہ کرتی رہتی ہیں، اسی طرح مشرک قوم اپنے معبودوں کی قسمیں بھی کھایا کرتی تھیں۔اس وجہ سے اسلام نے، جو آخری اور مکمل شریعت ہے ان تمام صورتوں کا بھی خاتمہ کر دیا جو ذریعۂ شرک ہو سکتی تھیں۔اس قسم کے شرک کو شرک شبہی کہہ سکتے ہیں۔

شرک کی ان اقسام کی توضیح کے لیے مناسب ہوگا کہ ہم قرآن مجید سے ان کی مثالیں پیش کریں۔قرآن نے اپنے زمانۂ نزول میں جن جماعتوں سے براہِ راست خطاب کیا ہے۔اور ان کے افعال و معتقدات میں شرک کا پتہ دیا ہے۔وہ تین ہیں۔اہل عرب (بنی اسمٰعیل)، اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) اور منافقین۔ان تینوں جماعتوں میں اہل عرب کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ قرآن نے ان کے لیے "مشرکین" کا لفظ بطور علم اور صفت کے استعمال کیا ہے۔بقیہ جماعتوں کی طرف فعلِ شرک کی نسبت تو ضرور کی ہے۔لیکن "مشرک یا مشرکین" کا لفظ بطریقِ علم یا صفت ان کے لیے استعمال نہیں کیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری جماعتیں توحید کو اساس و بنیاد کی حیثیت سے تسلیم کرتی تھیں۔ان کے اور مسلمانوں کے درمیان توحید بطور ایک مسلمہ اور قدرِ مشترک کے تھی۔یہود اور نصاریٰ میں سے کوئی بھی توحید کا منکر نہیں تھا۔اور منافقین تو اپنے تمام ظاہری اعمال و اعتراف میں گویا مسلمان ہی تھے، ان گروہوں کے اندر جو شرک تھا وہ ان کے اقرار و اعلان کے بالکل خلاف تھا۔برعکس اس کے مشرکین شرک کو بطور ایک اساسی عقیدہ کے

تسلیم کرتے تھے۔ خدائی کے اس کارخانہ میں ان کے شرکاء نہ صرف شریک تھے بلکہ وہ ناگزیر تھے۔ شرک کو تسلیم کیے بغیر ان کے نزدیک اس کائنات کا معمہ حل ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کی اس اہمیت کی وجہ سے شرک و توحید کی بحث میں قرآن نے بھی ان کو مقدم رکھا ہے اور ہم بھی ان کو مقدم رکھیں گے۔ چناں چہ ان کے اندر قرآن نے شرک کے جن اقسام کی نشان دہی کی ہے، ہم پہلے ان کو اجمال کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

☆☆

(۱)

مشرکین کا شرک

اہلِ عرب کے متعلق سب سے پہلی بات یہ جاننی چاہیے کہ ان میں کوئی جماعت خدا کی منکر نہیں تھی۔ بعض لوگوں نے ان کے قول:

وَ مَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ

''ہم کو تو بس گردش زمانہ فنا کرتی ہے۔''

سے یہ استدلال کیا ہے کہ ان میں بعض جماعتیں خدا کی منکر یا بہ اصطلاح جدید نیچری تھیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ عربوں میں نزولِ قرآن کے وقت دہریوں کی کوئی جماعت موجود نہیں تھی اور وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ جو وہ کہتے تھے تو اس سے ان کا مقصود خدا کی ہستی کا انکار نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ بات وہ قرآن کے اس دعوے کی تردید میں کہتے تھے کہ قوم کے عروج و زوال کا انحصار اس کے عقائد و اعمال کے صلاح و فساد پر ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کے لیے قرآن مجید ایک اخلاقی بنیاد قرار دیتا تھا۔ وہ عاد، ثمود، قوم لوط، اہلِ مدین اور قوم فرعون کی تباہی کا سبب ان کے کفر و شرک، ظلم، سرکشی، فسق، عدوان اور ان کے دوسرے عملی و اعتقادی فسادات بتاتا تھا اور عربوں کو متنبہ کرتا تھا کہ اگر انھوں نے اپنی اعتقادی و اخلاقی غلطیوں کی اصلاح نہ کی تو اپنی قوت و جمعیت کے باوجود مذکورہ قوموں کی طرح وہ بھی تباہ ہو جائیں گے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، وہ قوم کے عروج و زوال میں کسی اخلاقی اصول کو کارفرما نہیں مانتے تھے۔ وہ قوم کو ایک درخت کے مانند سمجھتے تھے، جو اگتا ہے، نشو و نما پاتا ہے، پھل پھول پاتا ہے یہاں تک کہ اپنی فطری قوتیں نچوڑ

کر ایک دن گردشِ لیل ونہار کی نذر ہو جاتا ہے۔ یا ایک فرد کی مانند سمجھتے تھے، جو پیدا ہو جاتا ہے، جوان ہو جاتا ہے پھر کسی بیماری کے سبب سے یا درازیِ عمر سے ایک دن مر جاتا ہے۔ موت و زیست کا جو طبعیاتی ضابطہ کائنات کے ہر گوشہ میں کام کر رہا ہے۔ قوموں کی موت وزیست میں بھی وہ اسی ضابطہ کو کارفرما مانتے تھے اور اپنے شعروں میں اسی نقطۂ نظر سے گزشتہ اقوام وقبائل کی تباہی کا ذکر کرتے تھے۔ قرآن مجید نے تاریخ ایک نقطۂ نظر سے پیش کی تھی، جو ان کے اس مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے بالکل مختلف تھا۔ اور دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ان سے نئے اصول زندگی کا مطالبہ کیا تھا، جو ان کی خواہشاتِ نفس کے بالکل خلاف تھا اس وجہ سے وہ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور جواب میں یہ کہتے تھے کہ وَ مَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ۔ قوم کی موت وزیست کو ان اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، قوموں کو تو صرف گردشِ روزگار فنا کرتی ہے، قوم کی نیکی وبدی کو اس کی تباہی میں کوئی دخل نہیں ہوا کرتا۔

اٹلی کے مشہور سیاسی فلسفی مکیاویلی کا مذہب بھی یہی ہے۔ وہ جب یہ کہتا ہے کہ حکومت ایک مجرد سیاسی وجود ہے، وہ اخلاقی ہے نہ قانونی، فرماں روا اور مدبّرین ملک کے تمام اعمال سیاسی کا محور صرف نہ فائدہ پرستی کو ہونا چاہیے، جس کام میں حکومت کا بھلا ہو رہا ہو یا جس بات کے لیے حکومت کی قوت وصلاحیت مقتضی ہو وہ ان کو کر گزرنی چاہیے۔ اس میں کسی ضابطۂ قانونی واخلاقی کو مانع نہیں ہونا چاہیے تو در حقیقت کوئی نئی بات نہیں کہتا ہے بلکہ ٹھیک عرب جاہلیت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔

الغرض اہلِ عرب خدا کے منکر نہ تھے اور نہ خدا کی بنیادی صفات میں سے کسی صفت کے منکر تھے۔ وہ زمین وآسمان، سورج اور چاند اور ابر وہوا کا خالق خدا ہی کو مانتے تھے، زندگی بخشنے والا، روزی دینے والا اور زندگی لینے والا اسی کو کہتے تھے۔ اپنی تمام قوتوں اور قابلیتوں کو اسی کا عطیہ جانتے تھے۔ اس کائنات کا انتظام وانصرام اسی کے دستِ تصرف میں سمجھتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی بعض ایسی باتیں بھی مانتے اور کرتے تھے، جن سے یا تو خدا کی صفتوں اور ان کے مقتضیات کا انکار لازم آتا تھا جو کفر ہے۔ یا خدا کی صفات اور اس کے حقوق میں دوسروں کی حصہ داری لازم آتی تھی، جو شرک ہے۔ قرآن نے ان کے اس تناقض پر ان کو جگہ جگہ متنبہ کیا ہے۔ ہم صرف ایک آیت نقل کرتے ہیں جو کافی ہوگی۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۖۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○ (یونس:۳۱،۳۲)

''پوچھو، کون تم کو روزی دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے؟ یا کون قدرت رکھتا ہے کان پر اور آنکھوں پر؟ اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے؟ اور کون عالم کا انتظام کرتا ہے؟ جواب دیں گے، اللہ، تو کہو کیا اس سے ڈرتے نہیں؟ وہی اللہ تو تمھارا حقیقی مالک ہے تو اس مالکِ حقیقی کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے! تو کہاں کھوئے جا رہے ہو۔''

اس تناقض نے اہلِ عرب کو خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسرے بہت سے خداؤں کی پرستش میں مبتلا کر دیا تھا، جس سے خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق میں شرک کی بہت سی قسمیں پیدا ہو گئیں اور وہ آہستہ آہستہ ان پر چھاتی چلی گئیں۔

قرآن کی روشنی میں اگر ان کی ان مشرکانہ پرستشوں کی تحلیل کی جائے تو ان کی پانچ قسمیں نکلیں گی۔ ملائکہ پرستی، جنات پرستی، کواکب پرستی، آباء پرستی، اور خود پرستی۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک پر اختصار کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

الف۔ ملائکہ پرستی

اہلِ عرب فرشتوں کو تو خدا کی بیٹیاں اور اس کی اولاد قرار دیتے تھے، جو صریحاً شرک فی الذات ہے اور اس سے اس کی شان بے ہمگی اور اس کے استغنا کی نفی لازم آتی ہے، جو کھلا ہوا کفر ہے۔ قرآن نے ان کے اس عقیدہ کی تردید اس طرح فرمائی ہے:

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (یونس:۶۸)

''وہ کہتے ہیں اللہ نے اپنے لیے اولاد بنائی ہے، وہ پاک ہے، وہ بے نیاز ہے۔ جو کچھ

آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کا ہے۔ تمھارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا تم خدا پر ایسی بات کی تہمت دھرتے ہو، جس کے متعلق تمھارے پاس کوئی علم نہیں ہے۔"

ان فرشتوں کو وہ خدا سے قربت کا وہ مقام دیتے تھے، جو عبدیت و بندگی کے مقام سے بالاتر اور الوہیت کے مقام سے قریب تر ہے اور یہ کھلا ہوا شرک فی الصفات ہے۔ قرآن نے اس کی تردید فرمائی:

وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ○ یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ○ (السجدۃ) (النحل:۴۹،۵۰)

"اور آسمان وزمین میں جتنے جاندار ہیں، سب اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں اور فرشتے بھی اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے، اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اوپر سے اور جو حکم پاتے ہیں اس کی تعمیل کرتے ہیں۔"

"تکبر نہیں کرتے" یعنی اپنے تئیں بندگی سے بالاتر نہیں سمجھتے، "اپنے رب سے ڈرتے ہیں اپنے اوپر سے" یعنی قربت حاصل ہونے کے باوجود خدا کے ساحتِ جلال تک ان میں سے کسی کی رسائی نہیں ہے۔ بس اوپر سے جو حکم نازل ہوتا ہے اُس کی تعمیل کر دیتے ہیں۔ یُؤْمَرُوْنَ عربی زبان میں مجہول کا صیغہ ہے، جو ظاہر کرتا ہے کہ حکم دینے والے کا مقام ان کی پہنچ سے بالاتر ہے۔ اس وجہ سے بجائے اس کے کہ وہ اپنی اس قربت پر فخر کریں۔ اور یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ اب وہ جو چاہیں خدا سے کہہ سکتے ہیں (جیسا کہ مشرکین کا ان کے بارے میں خیال ہے)۔ وہ ہر وقت خدا کی بندگی و اطاعت میں سرگرم اور اس کی خوشنودی اور قربت کے طلب گار رہتے ہیں:

یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ (بنی اسرائیل:۵۷)۔

مشرکین اپنے لیے بلاکسی واسطہ کے خدا کی قربت ناممکن خیال کرتے تھے، اس وجہ سے ان فرشتوں کو خدا تک رسائی کا وسیلہ بناتے تھے اور ان کی بندگی کرتے تھے۔ اس طرح شرک فی اللوازم یا شرک فی العبادۃ کی بدعت شروع ہوئی۔ قرآن مجید نے خود ان کی زبان سے ان کی ملائکہ پرستی کی یہی توجیہ پیش کی ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُہُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلۡفٰی ؕ (الزمر:۳)

''اور جنھوں نے اللہ کے سوا مددگار ٹھہرا لیے ہیں کہتے ہیں کہ ہم تو ان کو محض اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب کردیں۔''

دنیا کی فارغ البالی اور خوش حالی ان فرشتوں کی بندگی کی برکت سمجھتے ان کے خیال میں اولاد ان کی عنایت سے ملتی تھی۔ چناں چہ قرآن نے ان کے اس خیال کا اظہار کر کے اس کی تردید فرمائی ہے:

فَلَمَّاۤ اٰتٰہُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ فِیۡمَاۤ اٰتٰہُمَا ۚ فَتَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ۞ اَیُشۡرِکُوۡنَ مَا لَا یَخۡلُقُ شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ ۞ ۫ۖ (الاعراف:۱۹۰،۱۹۱)

''پس جب اللہ تعالیٰ ان کو بھلی چنگی اولاد دیتا ہے تو اس کی دی ہوئی چیز میں دوسروں کو ساجھی بناتے ہیں۔ وہ ان چیزوں سے جن کو وہ ساجھی ٹھہراتے ہیں برتر ہے۔ کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھیراتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتیں بلکہ پیدا کی جاتی ہیں۔''

اسی طرح روزی، ان کے خیال میں فرشتوں کی عنایت سے ملتی تھی۔ قرآن نے ان کے اس گمان کی تردید فرمائی۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لَکُمۡ رِزۡقًا فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ الرِّزۡقَ وَ اعۡبُدُوۡہُ وَ اشۡکُرُوۡا لَہٗ ؕ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ۞ (العنکبوت:۱۷)

''جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ تمھارے لیے ذرا بھی روزی پر اختیار نہیں رکھتے۔ پس اللہ ہی کے ہاں سے روزی چاہو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کی شکر گزاری بجالاؤ۔ اسی کی طرف جانا ہے۔''

اہل عرب موت کے بعد کی زندگی اور حساب و کتاب کو اگرچہ مستبعد خیال کرتے تھے، لیکن کہتے تھے کہ بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی پڑا اور حساب و کتاب کی نوبت بھی آئی تو یہ فرشتے جن کو ہم پوجتے ہیں ہماری سفارش کریں گے اور ہم پر کوئی آنچ نہ آنے دیں گے۔ ان کے

اس عقیدہ سے ایک طرف خدا کی صفتِ علم وعدل وحکمت کا انکار لازم آتا ہے، جو کفر ہے[1] اور دوسری طرف یہ خدا کی صفتوں میں غیر اللہ کو شریک کرنا ہے جو کھلا ہوا شرک ہے۔ قرآن نے اس کی مختلف پہلوؤں سے تردید کی ہے۔ ہم بعض آیتیں یہاں نقل کرتے ہیں جن سے ان کے عقیدہ کا صحیح پہلو بھی واضح ہو جائے گا اور قرآن نے جس پہلو سے اس کی تردید کی ہے، وہ بھی سامنے آ جائے گا۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِیْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝ اِنَّ لَكُمْ فِیْهِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ ۝ اَمْ لَكُمْ اَیْمَانٌ عَلَیْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۝ سَلْهُمْ اَیُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِیْمٌ ۝ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْیَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ۝ (القلم: ۳۵-۴۱)

”کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے کیسا فیصلہ کرتے ہو! کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے، جس میں تم پڑھتے ہو، اس میں تمھارے لیے وہی ہے جو چاہتے ہو؟ کیا تم نے ہم سے عہد لے رکھا ہے قیامت تک کے لیے تمھارے لیے وہی ہو گا جو تم کہو گے؟ پوچھو اس کا ذمے کون لیتا ہے، کیا ان کے شرکاء ہیں تو لائیں اپنے شرکا کو اگر وہ سچے ہیں۔“

اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ۝ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰى ۝ اِنْ هِیَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝ (النجم: ۱۹-۲۳)

”ذرا دیکھو تو لات اور عزیٰ کو اور مناۃ کو جو دوسرے کا تیسرا ہے۔ کیا تمھارے لیے

---

[1] اس عقیدہ سے خدا کی صفات علم وعدل وحکمت کا انکار کس طرح لازم آتا ہے؟ اس سوال کا تفصیلی جواب ہمارے رسالہ ”حقیقت توحید“ میں ملے گا۔ یہاں ہم صرف بالاجمال اہل عرب کے شرکیہ عقائد کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں؟ یہ تو بڑی بھونڈی تقسیم ہوئی! یہ تو محض نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری، یہ لوگ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور نفس کی خواہش کی حالاں کہ ان کے پاس ان کے رب کی ہدایت آچکی ہے۔''

ان آیتوں میں لات، مناۃ اور عزیٰ کا جو ذکر آیا ہے، یہ تینوں فرشتوں کے بت تھے اور تینوں کے نام عورتوں کے نام پر تھے۔ ان کی شفاعت پر مشرکین کو بڑا اعتماد تھا۔ اہلِ عرب ان کا طواف کرتے تھے اور طواف کے وقت یہ الفاظ دہراتے تھے:

تِلْکَ الْغَرَانِیْقَ الْعُلٰی وَ اَنَّ شَفَاعَتِھِنَّ لِتُرْتَجٰی.

''یہ بلند مرتبہ ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے۔''

آگے کی آیات میں ان کے اسی خیال کی تردید ہو رہی ہے۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی ۝ فَلِلّٰہِ الْاٰخِرَۃُ وَالْاُوْلٰی ۝ وَکَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُھُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰہُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْضٰی ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ تَسْمِیَۃَ الْاُنْثٰی ۝ (النجم: ۲۴-۲۷)

''کیا انسان جو آرزو کرے گا پا جائے گا! اللہ ہی کے لیے ہے دنیا اور آخرت اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں جن کی شفاعت کچھ کام نہ آئے گی الا آں کہ اللہ اجازت دے، جس کے لیے چاہے اور پسند کرے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (یعنی محض ایک مفروضہ کے درجہ میں مانتے ہیں)۔ وہ ملائکہ کے نام عورتوں کے نام پر رکھتے ہیں۔''

اشارہ ہے لات، عزیٰ اور منوٰۃ کی طرف۔

اس کے بعد شفاعت کے ابطال کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ شفاعت نیک کو بد اور بد کو نیک بنا دے، یہ بات اللہ تعالیٰ کے عدل اور حکمت کے بالکل خلاف ہے۔ ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پائے گا، خدا کی رحمت کے مستحق وہی ٹھہریں گے، جو بھلے کام کریں گے۔ گناہوں اور بدکاریوں سے بچیں گے، ہاں کبھی لغزش اور خواہشِ نفس کے غلبہ سے کسی بدی میں آلودہ ہو جائیں گے تو یہ علیحدہ چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا دامن بہت وسیع ہے۔ وہ بڑی برائیوں سے بچنے والوں کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں سے درگزر فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ یَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی الَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّکَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ (النجم: ۳۱، ۳۲)

’’اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے برائی کی ان کے کیے کا اور بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے بھلے کام کیے بھلا یعنی ان لوگوں کو جو بڑے گناہوں اور کھلی بدکاریوں سے بچتے ہیں مگر کبھی کسی بدی میں اتفاق سے پڑ جاتے ہیں، تیرا پروردگار وسیع مغفرت والا ہے۔‘‘

جن فرشتوں سے یہ امیدیں وابستہ کی گئیں لازماً وہ اس درجہ کی محبت کے بھی سزاوار قرار پائے جو صفاتِ الٰہی کے مقتضیات ولوازم اور اللہ تعالیٰ کے خاص حقوق میں سے ہے اور جو اسی کے لیے مخصوص ہونی چاہیے تھی۔ قرآن مجید ان کے اس شرک فی الحقوق کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَ لَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ (البقرۃ: ۱۶۵)

’’اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جنھوں نے اللہ کے سوا شرکاء ٹھہرا لیے ہیں۔ ان سے اس طرح محبت کرتے ہیں، جس طرح اللہ سے محبت کرنی چاہیے۔ اور جو اہلِ ایمان ہیں وہ اللہ سے سب سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں۔ کاش دیکھتے یہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا ہے، اس وقت کو جب دیکھیں گے عذاب کہ ساری قوت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ سخت عذاب والا ہے۔‘‘

یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (ان سے اللہ کے برابر محبت کرتے ہیں) کا مطلب یہ ہے کہ ان فرشتوں کے ساتھ ان کی یہ محبت مستقل محبت ہے۔ خدا کی محبت کے تابع نہیں ہے اور جو محبت خدا کی محبت کے تابع نہ ہو وہ شرک ہے۔ اہلِ ایمان کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی ہوتی ہے کہ دوسری تمام محبتیں اس کے تابع ہو جاتی ہیں، جہاں کوئی محبت خدا کی محبت سے متصادم ہوئی۔

انھوں نے فوراً اس سے استعفیٰ دے دیا یہ نہیں ہے کہ اس کی خاطر خدا اور اس کی شریعت کو نظر انداز کر بیٹھے۔ یہی مفہوم ہے وَالَّذِیْنَ آمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ کا۔

ان تمام امیدوں اور نیاز مندیوں کے بعد فرشتوں کی نسبت یہ عقیدہ رکھنا بھی لازم ہوگیا کہ وہ ان ساری دعاؤں اور عبادتوں اور اپنی بندگی کرنے والوں کے حالات سے باخبر بھی ہیں کیوں کہ اس کے بغیر ان کی بندگی کرنے اور ان سے محبت کرنے کا فائدہ کیا؟ چناں چہ وہ صفت علم کے اس مفہوم میں شریک ہوئے، جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ قرآن نے اس کی تردید کی ہے:

وَ یَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَیَّلْنَا بَیْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِیَّانَا تَعْبُدُوْنَ ○ فَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِیْنَ ○ (یونس: ۲۸-۲۹)

”اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے پھر جن لوگوں نے شریک ٹھیرایا ان سے کہیں گے ٹھیرو تم اور تمھارے شرکاء۔ پھر ان میں علیحدگی کر دیں گے اور ان کے شرکاء کہیں گے تم ہمیں نہیں پوجتے تھے اللہ ہمارے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے کہ ہم تمھاری بندگی سے بالکل بے خبر ہیں۔“

ب۔ جنّات پرستی

ملائکہ کی طرح جنات کو بھی اہلِ عرب بندگی سے مافوق اور زمرۂ الوہیت سے نسبت رکھنے والی مخلوق خیال کرتے تھے۔ قرآن نے ان کے اس خیال کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

وَ جَعَلُوْا بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَ لَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ○ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ (الصّٰفّٰت: ۱۵۸، ۱۵۹)

”اور انھوں نے اس کے اور جنات کے درمیان رشتہ قائم کر رکھا ہے حالاں کہ جنات کو خوب معلوم ہے کہ انھیں خدا کے حضور عاجزانہ حاضر ہونا ہے۔ خدا پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔“

اس نسبتِ بلند کی وجہ سے لازماً خدائی میں جنات بھی شریک قرار دیے گئے۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ (الانعام:۱۰۰)

''اور انھوں نے اللہ کے لیے جنات میں سے شرکا ٹھہرا لیے ہیں حالاں کہ اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔''

ان جنوں کو بالکل اس مفہوم میں نافع و ضار خیال کیا جانے لگا، جس مفہوم میں خدا کو نافع و ضار خیال کیا جانا چاہیے۔ یعنی یہ سمجھا جانے لگا کہ اگر یہ کسی کو نقصان پہنچائیں تو کوئی ان کو روکنے والا نہیں اور اگر کسی کو نفع پہنچائیں تو کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض اوقات اِن کے جوش و غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انسانی جانوروں کی قربانی کی جانے لگی جو تذلل اور نیاز کا آخری درجہ ہے اور خدا کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس کا حق دار ہو سکے۔ اگرچہ اس نے بھی بندوں سے اس صورت میں اس کا مطالبہ نہیں کیا ہے، جس صورت میں مشرکین اپنے ان شرکاء کے لیے جانی قربانیاں پیش کرتے تھے۔ قرآن اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ

(الانعام:۱۳۷)

''بہت سے مشرکین کے لیے ان کے شرکا (شرکا جن نے) قتل اولاد کو پسندیدہ بنا دیا۔''

مصائب و آفات میں ان کی دہائی دی جاتی تھی اور پناہ پکڑی جاتی تھی۔

وَ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (الجن:۶)

''اور یہ کہ انسانوں کی ایک جماعت جنوں کی ایک جماعت کی پناہ پکڑتی ہے۔''

زمرۂ الوہیت میں سے خیال کیے جانے کی وجہ سے یہ بھی خیال کیا جانے لگا کہ ان کی رسائی ملاء اعلیٰ تک ہے۔ وہاں سے غیب کی خبریں لاتے ہیں اور کاہنوں تک پہنچاتے ہیں، چناں چہ کہانت کے بازار کی ساری رونق ان ہی کے دم سے تھی۔ قرآن نے اس کی تردید کی ہے:

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِ الْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ (الصّٰفّٰت:۶-۱۰)

''ہم نے زیریں آسمان کو ستاروں سے آراستہ کیا اور ہر سرکش شیطان سے محفوظ کیا۔

وہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف کان بھی لگانے نہیں پاتے اور ہر طرف سے مارے جاتے ہیں، دھتکارنے کے لیے۔ اور ان کے لیے ایک عذاب دائمی ہے مگر ہاں جو کوئی اچک لے کوئی بات تو تعاقب کرتا ہے اس کا ایک دمکتا ستارہ۔"

غیب دانی کے شوق میں کاہنوں نے ان سے تعلق پیدا کیا اور اس راستہ سے ایک خلق کثیر کو انھوں نے سفلی علوم کے فتنوں میں مبتلا کر دیا اور جنوں کی پرستش شروع ہوگئی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ (انعام:۱۲۸)

"اے گروہ جن تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا۔"

یہ کاہن لوگ عبدیت و نیاز کے تمام لوازم ان کے لیے پورے کرتے اور غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے ان کا مراقبہ کرتے اور پھر جاہل عوام غیب کی باتیں معلوم کرنے کے شوق میں جب ان کے پاس آتے تو ان کو جھوٹی سچی باتیں بتا کر ان کو اُلو بناتے۔ قرآن نے ان کی اس مکاری کا ذکر کیا ہے۔

یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (الشعراء:۲۲۳)

"اور وہ کان لگاتے ہیں حالاں کہ ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔"

قرآن مجید چوں کہ مسجع اور مقفیٰ ہے اور کاہنوں کا کلام بھی مسجع اور مقفی ہوتا تھا۔ نیز قرآن مجید میں چوں کہ پیشین گوئیاں بھی ہیں اور کاہنوں کے کلام میں بھی پیشین گوئیاں ہوتی تھیں اس وجہ سے اس ظاہری مشابہت کی بنا پر ابتدائے نبوت میں قریش نے طعنہ دیا کہ آپ کاہن ہیں اور یہ وحی فرشتہ کی لائی ہوئی وحی نہیں ہے بلکہ جس طرح کاہنوں پر جنات وحی لاتے ہیں، اسی طرح محمد (ﷺ) پر بھی جنات وحی لاتے ہیں۔ قرآن نے اس کی تردید کردی۔

وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ○ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَ مَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ○
اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ○ (الشعراء:۲۱۰،۲۱۲)

"اس کو شیطان لے کر نہیں اترے ہیں اور نہ ان کے لیے یہ مناسب ہے اور نہ وہ یہ کر سکتے ہیں۔ وہ تو سننے سے معزول کر دیے گئے ہیں۔"

قرآن نے یہاں جو جواب قریش کو دیا ہے بعینہ وہی جواب اس سے پہلے اسی طرح

کے شبہ کے جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے معترض فریسیوں کو دیا تھا۔ فریسیوں نے جب حضرت مسیح علیہ السلام کے پر تاثیر کلام کو سنا اور ان کے معجزوں اور کارناموں کو دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ لوگ برابر ان کے گرویدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں تو ان کے بڑھتے اثر کو روکنے اور عوام کو ان سے بدگمان کرنے کے لیے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ انھوں نے بڑے شیطان بعلز بول کو کسی عمل کے ذریعے سے اپنے قابو میں کر لیا ہے اور اس کی مدد سے یہ معجزے دکھاتے ہیں اور رعب جمانے کے لیے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہ خدائی مدد سے کر رہے ہیں۔

متیٰ باب ۱۱: ۲۴-۲۶ میں ہے۔

"فریسیوں نے سن کر کہا، یہ بدروحوں کے سردار بعلز بول کی مدد کے بغیر بدروحوں کو نہیں نکالتا۔"

اس نے (مسیح نے) ان کے خیالوں کو جان کر ان سے کہا، جس بادشاہی میں پھوٹ پڑتی ہے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس شہر یا گھر میں پھوٹ پڑے گی وہ قائم نہ رہے گا اور اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہو گیا پھر اس کی بادشاہی کیوں کر قائم رہے گی۔"

قرآن نے بھی وَمَا يَنۢبَغِي لَهُمْ کے الفاظ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ وحی، جس کا ایک ایک حرف شیطان اور اس کے سارے مقاصد و محبوبات کے بالکل خلاف ہے، شیطان کی مدد سے کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ خود اپنے کاروبار ضلالت کو درہم برہم کرنے کے لیے ایسا مبارک صحیفۂ ہدایت کیسے نازل کر سکتا ہے؟ اگر وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنی سلطنت خود اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالی اور آپ اپنا دشمن ہو گیا ہے۔

دوسرا ٹکڑا وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝ (اور وہ کر بھی نہیں سکتے، وہ ملاءِ اعلیٰ کی خبریں سننے سے معزول کر دیے گئے ہیں) اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جس کا صافات والی آیت میں اوپر ذکر آ چکا ہے اور جس کا جنات نے خود، سورۂ جن میں اعتراف کیا ہے۔

وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ (الجن: ۹)

"اور ہم بیٹھتے تھے اس کے (آسمان) ٹھکانوں میں، سننے کے لیے ملاءِ اعلیٰ کی باتیں لیکن اب جو سنے گا تو پائے گا اپنے لیے ایک شہاب گھات میں۔"

ملاءِ اعلیٰ سے جنات کے اس تعلق کی قرآن نے جگہ جگہ تردید کی ہے اور بار بار یہ بات بیان فرمائی ہے کہ قرآن شیطانی تصرف سے بالکل پاک ہے اور ایسے مواقع پر بالعموم ستاروں کے گرنے، ان کے ٹوٹنے اور ان کے پھینکے جانے کی بطور شہادت قسم بھی کھائی ہے، جس سے شہابِ ثاقب کا گرنا اور شیاطین کا دھتکارا جانا مراد ہے۔ سورۂ واقعہ، سورۂ حاقہ، سورۂ تکویر اور سورۂ نجم میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ سورۂ شعرا میں ایک دوسرے پہلو سے اس کی تردید کی ہے۔ فرمایا کہ پیغمبر پر شیاطین نہیں آسکتے، جس طرح مکھی صرف غلیظ اور نجس چیزوں پر بیٹھتی ہے۔ اسی طرح جنات و شیاطین صرف گندی اور نجس روحوں پر ہی اترتے ہیں۔ وہ خدا کے رسولوں اور نبیوں پر آنے کی جرأت نہیں کر سکتے اور نہ ان کے کلام میں اپنی باتوں کی کوئی ملاوٹ کر سکتے ہیں۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ؕ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۙ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ؕ (الشعراء: ۲۲۱-۲۲۳)

”کیا میں تمھیں بتاؤں شیاطین کن لوگوں پر اترتے ہیں؟ وہ ہر لپاٹیے گنہگار پر اترتے ہیں (یعنی کاہنوں پر) وہ کان لگاتے ہیں (اخبارِ غیب سننے کے لیے بہ انداز مراقبہ بیٹھتے ہیں) اور اکثر جھوٹے ہوتے ہیں (یعنی حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی مگر بہت سی باتیں گھڑ کے سنا دیتے ہیں)۔“

ج۔ کواکب پرستی

دنیا کی تمام بت پرست قوموں میں سورج اور چاند کی پرستش رائج رہی ہے۔ اہلِ عرب بھی ان کو زمرۂ الوہیت میں خیال کرتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ قرآن نے اس کی تردید کی:

وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَ النَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ (حٰم السجدة: ۳۷)

”اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن سورج اور چاند ہیں، نہ سورج کو سجدہ کرو، نہ چاند کو، سجدہ کرو اس خدا کو جس نے ان کو پیدا کیا ہے، اگر تم اس کی بندگی کرتے ہو۔“

اہلِ عرب نکھتروں کی تاثیر کے بھی معتقد تھے۔ ان کا خیال تھا انوا (نکھتروں) کو زمین کی خوش حالی میں بڑا دخل ہے۔ بارش وہ انھیں کے جود و کرم کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ بارش ہوتی تو کہتے

مطر فامنوء کذا 'فلاں نکھتر خوب برسی' اور یہ نسبت ان کے نزدیک مجازی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ فی الحقیقت اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ پانی برسانا ان نکھتروں کا ہی کام ہے۔ مشہور ستارہ شعریٰ بھی اہلِ عرب کا معبود تھا۔ یہ گرمیوں کے زمانہ میں طلوع ہوتا تھا۔ تابط شرا کا شعر ہے:

شامس فی القوحتی اذا ما
ذکت الشعری فبرد و ظل

(ممدوح) سردیوں میں گرمی پہنچاتا ہے یہاں تک کہ جب شعری طلوع ہوتا ہے (گرما میں) تو وہ ٹھنڈا اور سایہ بن جاتا ہے۔

عرب میں جاڑوں کا موسم قحط وافلاس کا موسم ہوتا تھا۔ شمال کی ٹھنڈی ہوائیں اس زمانہ میں پورے ملک کی تمام کاروباری سرگرمیوں کو سرد کر دیتی تھیں اسی وجہ سے اہلِ عرب جاڑے کے موسم کو "اَیَّامِ نَحِسَاتٍ" کہتے تھے۔ آمد ورفت اور تجارت کی چہل پہل زیادہ تر گرمیوں کے موسم کے ساتھ مخصوص تھی اور چوں کہ یہی زمانہ شعری کے طلوع ہونے کا زمانہ ہوتا تھا، اس وجہ سے یہ ساری خیر وبرکت اسی کی طرف منسوب ہوتی تھی۔ قرآن نے سورۂ نجم میں اسی وہم کی تردید کی ہے:

وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى ۝ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ۝ (النجم: ۴۸،۴۹)

"اور وہی لوگوں کو مال دار اور سرمایہ دار کرتا ہے اور وہی شعریٰ کا رب ہے۔"

اہلِ عرب کے تصور مذہبی نے ان مختلف عناصر کو چھوڑ کر دیوتاؤں کی ایک بزم (Gods-constellation) سجائی، جس میں خدا کی حیثیت ایک عرش والے (ذو العرش) یا مہادیو کی قرار دی اور ان دیوتاؤں کو مقربین بارگاہ اور ارکانِ سلطنت کی حیثیت بخشی۔ پھر اس تصور میں تشبیہ نے جو ہمیشہ سے شرک کے نہایت اہم اسباب وعوامل میں رہی ہے۔ رنگ آمیزی کی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح زمین کے ملوک وسلاطین اپنے دور دراز کے علاقوں کا انتظام اپنے حکام وعمال کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح خدائے عرش نشیں نے بھی زمین کے معاملات کا انتظام وانصرام ان دیوتاؤں کے سپرد کر چھوڑا ہے، اس نے اپنا تعلق صرف آسمان کے نظم واہتمام سے رکھا ہے، جس کو دار السلطنت کی حیثیت حاصل ہے۔ باقی رہی زمین تو اس کے معاملات میں اس کی حیثیت بس ایک گوشہ نشیں علۃ العلل کی ہے، اس کی عام تدبیر وسیاست سے وہ بذاتِ خود متعلق (In touch) نہیں ہے۔ یہ تصور ایک تنزیہی تصور ہے، جو بعض مشرک اقوام میں پایا جاتا

ہے لیکن یہ تنزیہ ایک طرف تو خدا کی قدرت اور علم کی نفی ہے۔ دوسری طرف اس سے خدا کی خدائی اور اس کی حاکمیت کی تقسیم لازم آتی ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کی تردید فرمائی ہے۔

اس تقسیم سے خدا کی قدرت اور اس کے علم کی جو نفی ہوتی ہے اور اس پر عجز اور ناواقفیت کا جو عیب لگتا ہے اس کی تردید اس طرح فرمائی ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ (البقرۃ:۲۵۵)

"اللہ، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، زندہ اور قائم رہنے والا اس کو اونگھ اور نیند نہیں لاحق ہوتی، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کے لیے ہے۔"

وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ (البقرۃ:۲۵۵)

"اس کی سلطنت آسمان وزمین سب پر حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پر گراں نہیں۔"

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ (یونس:۳)

"تمھارا مالک وہ اللہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمینوں کو چھ دن میں، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا انتظام کرتا ہوا۔"

اس تقسیم سے خدا کی بادشاہی میں بٹوارے کی جو شکل پیدا ہوتی ہے اس کی تردید اس طرح فرمائی ہے:

وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ○ (النحل:۵۱)

"اور اللہ نے فرمایا نہ بناؤ دو معبود وہ تو ایک ہی معبود ہے۔ پس مجھی سے ڈرو۔"

وَ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ ○ (الزخرف:۸۴)

"وہی ایک آسمان میں بھی معبود ہے اور وہی ایک زمین میں بھی معبود ہے اور وہ حکمت والا اور علم والا ہے۔"

اسی تصور کی تردید ان آیات میں بھی ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل:۴۲)

''کہو اگر اس کے ساتھ معبود بھی ہوتے جیسا کہ وہ کہتے ہیں تو وہ تو عرش والے سے نزاع کی راہ ڈھونڈتے۔''

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (الانبیاء:۲۲)

''اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو وہ دونوں درہم برہم ہوجاتے۔''

زمین کے معاملات میں براہِ راست متصرف ماننے کی وجہ سے اہل عرب نے اِن دیوتاؤں کو عبادت وتعظیم کے ان تمام لوازم کا مستحق ٹھیرایا جو خدا کے لیے مخصوص تھے۔ خدا کے لیے کعبہ تھا، ان کے لیے بھی الگ الگ استھان اور معبد بنائے گئے۔ خدا کے لیے حج اور قربانی کے طریقے تھے، ان کے لیے بھی حج اور قربانی کے مراسم اختیار کیے گئے۔ خدا نے اپنے لیے شعائر اور قربانی و نیاز کے جانور مقرر کیے تھے، مشرکین نے اپنے معبودوں کے لیے بھی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام مخصوص کردیے۔[1] خدا کے لیے زمین کی پیداوار اور چوپایوں میں سے ایک متعین حصہ تھا، ان کے دیوتا بھی اس حصہ کے مستحق ٹھیرے اور چوں کہ زمین کے نظم واہتمام کے اصلی ذمہ دار، ان کے خیال کے مطابق یہی تھے، اس وجہ سے خدا کے مقابل میں ان کا حق کچھ مرجح ہی رہا۔ (وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (الانعام:۱۳۶)[2]) خدا کا حصہ ان کے شرکاء کی طرف منتقل ہوسکتا تھا، لیکن شرکاء کا حصہ خدا کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا تھا، خدا کے لیے صرف جانوروں کی قربانی تھی، لیکن شرکاء کے لیے جیسا کہ اوپر گزرا، بعض حالات میں اولاد تک کی قربانی پیش کی جاتی تھی۔ خدا نے صرف چند چیزیں حرام کی تھیں لیکن ان کے دیوتاؤں کے تعلق سے بہت سی چیزیں حرام (TA Boo)

---

(۱) بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام یہ جانوروں کی مختلف قسمیں ہیں، جن کو اہل عرب اپنے دیوتاؤں کے نام پر چھوڑتے تھے اور ان کو ہدی کے جانوروں کی طرح مقدس سمجھتے تھے۔

(۲) اور اللہ نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے اس میں انھوں نے اللہ کا ایک حصہ رکھا، پس کہا کہ یہ اللہ کے لیے ہے، ان کے زعم کے مطابق اور یہ ہمارے شرکاء کے لیے ہے، پس جو حصہ ان کے شرکا کا ہوتا ہے وہ اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے شرکاء کو مل سکتا ہے۔ برا فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں۔

ہو گئیں۔ خدا وحی و الہام نازل کرتا تھا یہ دیوتا بھی فال کے تیروں کی زبان سے اپنے غیبی فیصلے صادر کرنے لگے۔

خواص یہ ساری نیاز مندیاں ملائکہ، جنات اور کواکب کے لیے بجالاتے تھے۔ لیکن عوام کو اتنی پرواز بھی نصیب نہیں تھی وہ مٹی، پتھر اور لکڑی وغیرہ کے بنے ہوئے بتوں ہی کو اصل کار فرما مانتے تھے۔ اسی وجہ سے قرآن نے بت پرستی کی تردید میں خواص و عوام دونوں کی ذہنیت کو سامنے رکھا ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف میں پہلے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ (الاعراف: ۱۹۴)

"جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو تمہارے ہی طرح بندے ہیں۔ پس ان کو پکارو، تمھاری فریاد رسی کریں اگر تم سچے ہو۔"

پھر فرمایا:

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَا ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَا ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ (الاعراف: ۱۹۵)

"کیا ان کے پاؤں ہیں، جن سے چلتے ہیں۔ کیا ان کے ہاتھ ہیں، جن سے پکڑتے ہیں۔ کیا ان کے آنکھیں ہیں، جن سے دیکھتے ہیں اور کیا ان کے کان ہیں، جن سے سنتے ہیں۔"

د- آباء پرستی

دیوتاؤں کی اِس بزم میں انھوں نے اپنے آباواجداد میں سے ان بزرگوں کو جگہ دی، جس کے مذہبی تقدس کی روایات ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی قبریں اور ان کے آثار حصولِ برکت و قبولیتِ دعا کے مرکز بنتے بنتے بالآخر معبد بن گئے۔ اور آہستہ آہستہ ان کے متعلق بھی انھوں نے اس طرح کے عقائد و تصورات قائم کرلیے، جس طرح کے عقائد و تصورات انھوں نے جنات اور ملائکہ سے متعلق قائم کرلیے تھے۔ اور جن کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ قرآن نے ان کی تردید فرمائی۔

وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ؕ○

اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ ۚ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ۙ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ ۝ (النحل: ۲۰،۲۱)

"اور جن کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کرتے بلکہ خود مخلوق ہیں مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں انھیں کچھ خبر نہیں کہ کب اٹھیں گے۔"

اس آباء پرستی کی سب سے زیادہ منحوس شکل یہ تھی کہ آباء و اجداد کے رواج اور چلن کو انھوں نے دین اور شریعت کی حیثیت دے دی چناں چہ پیغمبر ﷺ کی دعوت کی مخالفت میں سب سے زیادہ قوی محرک ان کا یہی آباء پرستی کا خبط تھا۔ جب ان کو اللہ کے رستہ پر چلنے کی دعوت دی جاتی اور خدا کے احکام و قوانین بتائے جاتے تو کہتے، کیا ایک مجنوں شاعر کے کہنے سے ہم اپنے آباوَاجداد کا طریقہ چھوڑ دیں! یہ نہیں ہوسکتا۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ قَالُوۡا حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوۡ کَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا وَّ لَا یَهۡتَدُوۡنَ ۝ (المائدۃ: ۱۰۴)

"جب ان سے کہا جاتا ہے اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف آؤ، کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو جس ڈھرے پر پایا ہے وہ ہمارے لیے بس ہے کیا اگر ان کے آباوَاجداد کچھ نہ جانتے رہے ہوں اور ہدایت پر نہ رہے ہوں جب بھی؟"

اس آیت کے آخری حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ دادا کا چلن اس اعتبار سے تو اچھی چیز ہے کہ طبیعت کو اس سے انس اور لگاؤ ہوتا ہے، لیکن کسی چلن کی اچھائی کے لیے مجرد اتنی بات کافی نہیں ہوسکتی کہ وہ آباوَاجداد سے چلا آرہا ہے، اس کے متعلق سب سے مقدم سوال یہ ہے کہ وہ عقل کے خلاف تو نہیں ہے۔ فطرتِ انسانی سے بعید تو نہیں ہے، اخلاق کے منافی تو نہیں ہے۔ بالاجمال یہ کہ خدا کے بتائے ہوئے طریقہ سے الگ تو نہیں ہے؟ اگر ان کسوٹیوں پر وہ صحیح اتر جائے تو بے شک وہ صحیح ہے اور آباءاجداد کا طریقہ ہونا اس کی صحت کے لیے ایک مزید سفارش ہے اور اگر ان کسوٹیوں پر وہ کھوٹا ثابت ہو جائے تو وہ باطل ہے اور کسی باطل کا موروثی ہونا اس کی صحت کی دلیل نہیں ہوسکتا۔

اس معاملہ میں دنیا ہمیشہ سے افراط و تفریط میں مبتلا رہی ہے۔ جاہلیت قدیمہ کا نظریہ تو جیسا کہ اوپر گزرا، یہ تھا کہ آباوَاجداد کا طریقہ بہر صورت حق ہے۔ اس کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ آباوَاجداد سے چلا آرہا ہے۔ جاہلیت جدیدہ اس معاملہ میں جو نقطۂ نظر رکھتی ہے اس کی

P-353246

بہترین ترجمانی مشہور شاعر ٹینی سن کے لفظوں میں یوں کی جاسکتی ہے کہ ''اگر بہتر سے بہتر چلن بھی ہمیشہ باقی رہے تو دنیا کو بگاڑ ڈالے۔''

یہ دونوں راہیں افراط وتفریط کی راہیں ہیں۔ایک کی بنا تقلید اعمیٰ پر ہے جو عقل سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے۔دوسری کی بنا خیرہ سری اور بد دماغی پر ہے جو عقل کو اس کی حد سے بڑھانے کا نتیجہ ہے۔ایک شرک و بت پرستی کی ایک خاص قسم آباء پرستی (Ancestor worship) کی طرف رہبری کرتی ہے۔دوسری الحاد وزندقہ کی طرف لے جاتی ہے، جو خود پرستی کا دروازہ ہے۔ اوران دونوں ہی راہوں میں انسان خداپرستی کی حقیقت سے محروم اور عاقبت بینی کی ذمے داریوں سے بالکل غافل ہوجاتا ہے۔اگر انسان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنی عقل وتمیز پر مہر لگا کر چوپایوں کے گلّے میں داخل ہوجائے تو یہ بات بھی جائز نہیں ہوسکتی کہ ایک راستہ کی غلطی اور دوسرے کی صحت کا فیصلہ کیے بغیر وہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے پر چل کھڑا ہوا۔

ان دونوں راہوں میں انسان شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کا مجرم ہے، عقل وفطرت کا راستہ وہ ہے، جس کی شہادت دنیا کے اچھے انسانوں اور انبیاء علیہم السلام کی قبل بعثت کی زندگیوں سے ملتی ہے۔ان کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جوں ہی سن رشد کی کرنیں ان پر چمکیں۔انھوں نے سب سے پہلے اپنے اس ذہنی ورثہ کا جائزہ لیا جو انھیں آباء اجداد سے پہنچا تھا اور اس میں سے جو چیز بھی انھیں عقل وفطرت سے متناقض نظر آئی اس کو انھوں نے بے درنگ چھوڑ دیا۔اس راہ میں انھیں خلق کی طرف سے بے شمار مصیبتیں بھی جھیلنی پڑیں لیکن اس کی انھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔یہ لوگ نوعِ انسانی کے گلِ سرسبد تھے اور اپنے اس جوہر کی وجہ سے حق سے مستفید ہونے میں ہم سب سے آگے رہے، جس طرح سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی کرنیں سب سے پہلے اونچی منڈیروں ہی پر چمکتی ہے اسی طرح جب کبھی دنیا میں آفتابِ حق طلوع ہوا، ان ہی کے دل و دماغ اس سے سب سے پہلے نورانی ہوئے۔

اس کی عمدہ مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی ہے۔آپ نے فرمایا:

اِنِّی تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ ھُمْ بِالْاٰخِرَةِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ ○ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ط

(یوسف:۳۷،۳۸)

''میں نے اس قوم کے مذہب کو چھوڑا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی تھی اور وہ آخرت کی بھی منکر تھی اور میں نے اپنے آباء واجداد ابراہیم واسحٰق اور یعقوب کی پیروی کی۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق معلوم ہے کہ ظاہر میں نہ انھوں نے کسی مذہب کو اختیار کیا اور نہ کسی مذہب کو ترک کیا، جس مذہب پر پیدا ہوئے تھے روزِ اول سے اپنی حیاتِ پاک کے آخری انفاس تک اسی مذہب پر رہے۔ نبوت کے بعد اسی مذہب کی ان پر وحی ہوئی۔ مصر میں انھیں قبطیوں کے مذہب سے سابقہ پڑا لیکن ان کا پاک دل ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی نجاستوں سے آلودہ نہیں ہوا۔ تاہم وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک قوم کے مذہب کو جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتی تھی، چھوڑا اور اپنے آبا واجداد ابراہیم اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کے مذہب کو اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ ترک واختیار عقلی و باطنی ہے۔ انھوں نے اپنے آبا واجداد کے مذہب کو محض میراثِ پدر سمجھ کر نہیں اپنا رکھا تھا بلکہ ایک پاکیزہ فطرت اور متقی دل کی تمام کاہشوں اور کاوِشوں کے ساتھ اس کی صداقت اور حقانیت کو جانچا پرکھا تھا، وہ طریقہ ان کے لیے خود ان کا اپنا انکشاف تھا۔ اس لیے اپنا بن چکا تھا اور ان کے دل کے ریشہ ریشہ میں اترا ہوا تھا۔ اس کی صحت پر ان کی عقل گواہ تھی اور اس کے فطری اور خدائی ہونے پر ان کا دل بالکل مطمئن تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس لیے نہیں لگ گئے تھے کہ باپ دادا کی عصبیت میں گرفتار تھے بلکہ تمام جہان میں اگر ایک متنفس بھی اس راستہ پر نہ ہوتا جب بھی ان کا راستہ وہی ہوتا۔ البتہ یہ اللہ کا ایک مزید فضل تھا کہ وہی راستہ ان کے آباء واجداد کا بھی تھا۔

اس کی شہادت ان کی مصر کی پر محن زندگی سے ملتی ہے۔ آزمائشوں کی کیسی کیسی گھٹائیں امنڈ امنڈ کے آتی ہیں لیکن ان کے قدم کو لغزش نہیں ہوتی، بلکہ تاریکی جتنی ہی بڑھتی جاتی ہے ان کا ایمان اتنا ہی مضبوط ہوتا جاتا ہے اور جتنا ہی ان کو ہلانے کی کوشش کی جاتی ہے ان کے قدم راہِ حق پر اتنے ہی اور زیادہ استوار ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں جو لوگ بھی کسی راستہ کو اس نورِ بصیرت کی رہنمائی میں اختیار کرتے ہیں وہ اس کو فی الحقیقت اختیار کرتے ہیں، اس کی تقلید نہیں کرتے اگرچہ وہ راستہ ان کے آبا واجداد ہی کا راستہ ہو اور ایسے لوگ دوسری راہوں کو جو چھوڑتے ہیں تو درحقیقت وہ ''چھوڑتے ہیں'' اگرچہ ایک قدم بھی وہ ان پر چلے نہ ہوں۔ یہی بصیرت واجتہاد روحِ دین ہے۔ یہ نہ ہو تو تمام ادیان بے جان و بے روح ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک شخص کسی حق

کو بھی اختیار کرے مگر اس لیے نہیں کہ وہ حق ہے اور خدا کی طرف سے ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے آباواجداد کا طریقہ ہے۔ تو یہ بھی عرب جاہلیت کی اسی آباء پرستی میں داخل ہے، جو شرک ہے۔

ر۔ خود پرستی

دیوتاؤں کی اس بزم میں مشرکینِ عرب خود بھی شریک تھے لیکن وحی الٰہی کی تنبیہ سے پہلے جس طرح انھیں اپنے بہت سے دوسرے مشرکانہ اعمال وعقائد کا شعور نہیں تھا اسی طرح اس چیز کے شعور سے بھی محروم تھے۔ وہ اپنے تئیں خدا کا بندہ تو کہتے تھے لیکن بندگی کے مقتضیات و لوازم سے بے خبر تھے، اس وجہ سے حدودِ بندگی سے تجاوز کر کے حدودِ الوہیت میں داخل ہو گئے تھے۔ قرآن نے ان کی اس طرح کی تعدیوں کی جو صورتیں بیان کی ہیں، ہم ان کا بالاجمال ذکر کریں گے اور یہ بحث نہایت قابلِ توجہ ہے۔

الف: یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اہل عرب کو اپنی عبدیت اور خدا کی خالقیت و ربوبیت سے انکار نہیں تھا، لیکن اس کے لوازم یعنی خدا کی بندگی اور پھر بندگی کے لوازم یعنی تنہا اللہ کی اطاعت میں وہ جادۂ حق سے منحرف تھے۔ وہ اطاعت میں دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے۔ عبادت اور بندگی کا مفہوم ان کے ہاں ''پوجاپاٹ'' سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ اس بات میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے کہ عبادت خدا کی ہوتی رہے اور اطاعت اپنی یا کسی اور کی۔ وہ اللہ کی ہدایت کی جگہ اپنے نفس، اپنے آباواجداد اور اپنے سرداروں اور لیڈروں کی خدا کے احکام کے خلاف پیروی کر کے بھی یہی خیال کرتے تھے کہ اس سے اللہ کی بندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن قرآن نے متنبہ کیا کہ خدا کی عبادت اس کی اطاعت کے بغیر بے معنی ہے۔ خدا کی بندگی کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ صرف اسی کی اطاعت کی جائے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ○ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (الزمر: ۲، ۳)

''ہم نے تمھاری طرف کتاب اتاری ہے، حق کے ساتھ پس اللہ ہی کی بندگی کرو اسی کی اطاعت[۱] کرتے ہوئے، ہاں اطاعت خالص اللہ ہی کے لیے زیبا ہے۔''

---

(۱) دین کے معنی یہاں اطاعت کے ہیں: الدین الطاعة و قد دینة و دنت له اطعته و قال عمرو بن کلثوم و ایاما لنا غرًا کرامًا عصیا الملک فیها ان ندینا.

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں۔ سب کو نقل کرنے میں طوالت ہے۔ ان سب کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے جو دین نازل کیا تھا، اس میں تحریف وتبدیل نے بہت سے اختلاف ڈال دیے تھے اور بے شمار بدعتیں داخل ہوگئی تھیں۔ اس وجہ سے خدا کی خالص عبادت و بندگی کی راہ مسدود ہوگئی تھی۔ ان بدعات کی موجودگی میں جو لوگ بھی عبادت کر رہے تھے وہ خدائے واحد کی عبادت سے محروم تھے۔ وہ نام تو اللہ کا ضرور لیتے تھے۔ لیکن ہر قدم پر غیر اللہ کی اطاعت سے دوچار تھے۔ اس کتاب نے یہ اختلافات مٹا دیے اور شریعت کو غیر الٰہی عناصر سے پاک کر دیا۔ یہ حق و باطل کے درمیان ایک قولِ فیصل کی حیثیت سے نمودار ہوگئی ہے۔ اب خدا کی اطاعت و بندگی کی سیدھی راہ باز ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو تنہا اسی کی اطاعت کرتے ہوئے یعنی بندگی وہی معتبر ہے جو خالص اطاعت کے ساتھ ہو۔ اگر محض مخصوص اوقات میں خدا کا نام جپ لیا جائے۔ اور اطاعت میں اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کیا جائے خواہ وہ شریک انسان کا اپنا ہی نفس ہو تو یہ بندگی نہیں "نمرود کی خدائی" ہے، جس سے کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے: اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَیۡهِ وَكِیۡلًا ۝ [1] (الفرقان: ۴۳)

خدا کی اطاعت کا راستہ یہ ہے کہ اس کے انبیا کی پیروی کی جائے: وَ مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ (جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی)۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی کی دعوت یہ رہی ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اور میری اطاعت کرو: اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوۡهُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ (نوح: ۳) اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی اطاعت و بندگی کی راہ یہ ہے کہ نبی کی اطاعت کی جائے اور ساتھ ہی ان لوگوں کے راستہ کی پیروی سے انکار کیا جائے جو اللہ کے راستے سے منحرف ہیں۔ چناں چہ انبیائے کرام علیہم السلام نے اس کی بھی تصریح فرما دی کہ وَلَا تُطِیۡعُوۡۤا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ۝ (الشعراء: ۱۵۱) ہماری اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کرو، جنھوں نے حدودِ الٰہی سے تجاوز کیا ہے اور خدا کے باغی ہیں۔

توحید کا یہی وہ مقام ہے، جہاں موحدین اور مشرکین میں اصلی نزاع برپا ہوتی ہے۔ جب خدا کی عبادت صرف "پوجا پاٹ" پر قناعت نہیں کرتی بلکہ یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ جو خدا کے بندے ہیں وہ صرف خدا ہی کی اطاعت بھی کریں اور اس کی اطاعت کے سوا ہر اس اطاعت کو

---

(۱) دیکھو تو اس کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے، کیا تم اس کے ذمے دار ہو سکتے ہو؟

شرک قرار دیں جو خدا کی اطاعت کے خلاف ہے تو اس بات کو وہ لوگ نہیں برداشت کر سکتے جو خود اپنی خدائی کے دعوے دار ہوتے ہیں۔

علمائے اسلام میں سے علامہ ابن تیمیہؒ نے اس بحث پر العبودیۃ کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے جو نہایت مفید مباحث پر مشتمل ہے۔ اس سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ ''عبادت'' صرف چند رسوم کا نام نہیں ہے بلکہ پورا دین اس کے مفہوم میں داخل ہے اور یہ کہ اطاعت کے بغیر خدا کی عبادت کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں۔

ب: اسی بنیاد پر قرآن نے وضعِ قانون مخصوص اللہ تعالیٰ کا حق قرار دیا اور کسی کے لیے اس میں ادنیٰ شرکت بھی گوارا نہیں فرمائی۔ چناں چہ اکثر جگہ توحید کے بیان کے ساتھ اس امر کا بھی ذکر کیا کہ کسی شے کو حرام اور کسی چیز کو حلال قرار دینا اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ وہ بادشاہ ہے۔ اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی رعیت اور اپنی مملکت کے لیے قانون بنائے۔ اس کے قانون کے خلاف قانون سازی توحید کی خلاف ورزی، خطواتِ شیطان کی پیروی اور خدا کی عبادت کی نفی ہے۔ جو شخص اللہ کے قانون کے خلاف قانون بناتا ہے، وہ اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتا ہے اور اگر دوسرے کے لیے اس حق کو تسلیم کرتا ہے تو اس کو اللہ کے سوا رب بناتا ہے۔ اور اگر اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو یہ شرک کے ساتھ خدا پر افترا بھی ہے۔ سورۂ بقرہ میں آیات ۱۶۳-۱۷۳ پڑھیے۔ شروع کی پانچ آیتوں میں توحید کا بیان ہے۔ پھر اسی کے ذیل میں یہ آیت آتی ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِى الْأَرْضِ حَلَـٰلًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَٰتِ الشَّيْطَـٰنِ ۚ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ (البقرۃ:۱۶۸)

''اے لوگو، کھاؤ ان چیزوں میں سے جو زمین میں ہیں حلال اور پاکیزہ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔''

شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو، سے اس کی دعوتِ شرک کی طرف اشارہ ہے، جس کا اس نے روزِ اول ہی میں اعلان کر دیا تھا۔

وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَـَٔامُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ ءَاذَانَ الْأَنْعَـٰمِ وَلَـَٔامُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ (النسآء:۱۱۹)

''میں ان کو بھٹکاؤں گا، آرزوؤں میں پھنساؤں گا، اور مشورہ دوں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور مشورہ دوں گا تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو بدلیں گے۔''

اس کے بعد شیطان کی دعوت کا اصلی مقصد واضح کیا ہے کہ وہ برائی اور بے حیائی کی دعوت دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسان خود اپنے جی سے حلال و حرام کرے اور اپنا شارع آپ بنے اور پھر بلا سند اس کو خدا کی طرف منسوب کرے۔ (اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ)۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر انسان کو قانونِ الٰہی کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو باپ دادا کی روایات کی سند لاتا ہے حالاں کہ باپ دادا کی روایت کوئی سند نہیں ہے جب تک ان کے اقوال و اعمال کی بنیاد شرعِ الٰہی پر نہ ہو۔ باپ دادا کے طریقہ پر شریعت کی سند کے بغیر جم جانا اپنے آپ کو انسانوں کی صف سے نکال کر چوپایوں کے گلہ میں داخل کر دینا اور گونگوں، بہروں اور اندھوں کے زمرہ میں شامل ہو جانا ہے۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ ○ وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ○ (البقرۃ:۱۷۰:۱۷۱)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے اتاری ہے، تو جواب دیتے ہیں کہ ہم اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا اس صورت میں بھی کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہِ حق پر رہے ہوں؟ ان کافروں کا حال بالکل ویسا ہی ہے جیسے ایک شخص پکارے ایک گلہ کو جو پکار اور آواز کے سوا کچھ بھی نہیں سنتا۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں پس یہ سمجھنے کے نہیں ہیں۔''

پھر فرمایا کہ جو لوگ خدا کی عبادت کے مدعی ہیں تو اس کی عبادت صرف اس طرح نہیں ہو سکتی کہ عبادت تو اس کی کریں لیکن حرام و حلال اپنے جی سے کرتے پھریں۔ اس کی عبادت کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ وضعِ قانون اور تشریع کا حق خالص اسی کے لیے تسلیم کریں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْا

لِلّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ ○ (البقرۃ:۱۷۲)

''اے ایمان والو، کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم اسی کی بندگی کرتے ہو۔''

اسی بنیاد پر اللہ کے ایمان اور اس کی بندگی کے لیے تمام خدائی ادیان میں اس بات کو ایک لازمی شرط قرار دیا گیا ہے کہ زندگی کے معاملات اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق چلائے جائیں اور اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی اور چیز کو رہنما نہ بنایا جائے۔ قرآن سابق امتوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے خبر دیتا ہے کہ یہی حکم یہود کو دیا گیا تھا:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِیۡهَا هُدًی وَّ نُوۡرٌ ۚ یَحۡكُمُ بِهَا النَّبِیُّوۡنَ الَّذِیۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوۡا عَلَیۡهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخۡشَوُا النَّاسَ وَ اخۡشَوۡنِ وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ○ (المائدہ:۴۴)

''ہم نے توریت اتاری، جس میں رہ نمائی اور روشنی ہے۔ اس کے ذریعہ سے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ فرماں بردار انبیاء یہودیوں کے لیے اور اسی کے ذریعے سے فیصلہ کرتے تھے ربی اور علماء۔ کیوں کہ وہ اللہ کی کتاب کے امین تھے اور اس پر گواہ بنائے گئے تھے اور ان کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ لوگوں سے نہ ڈرنا اور مجھ سے ہی ڈرنا اور میری آیات کو تھوڑی پونجی کے عوض نہ بیچنا اور جو نہ فیصلہ کریں گے اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ لوگ کافر قرار پائیں گے۔''

پھر قرآن مجید خبر دیتا ہے کہ بعینہٖ یہی حکم نصاریٰ کو بھی دیا گیا تھا۔ وہ بھی اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق معاملاتِ زندگی کو چلائیں۔ ورنہ فاسق ٹھہریں گے۔

وَ لۡیَحۡكُمۡ اَهۡلُ الۡاِنۡجِیۡلِ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فِیۡهِ ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ○ (المائدۃ:۴۷)

''اور چاہیے کہ اہل انجیل فیصلہ کریں اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔''

پھر بتایا کہ جو حکم ان امتوں کو دیا گیا تھا بعینہٖ وہی حکم مسلمانوں کو بھی دیا جاتا ہے کہ زندگی

کے تمام معاملات کو اس کتاب کی رہ نمائی میں چلائیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ (المائدۃ:۴۸)

''اور ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے قول فیصل کے ساتھ، اس کتاب کی پیشین گوئیوں کے مطابق جو اس سے پہلے سے ہے، اور اس کی نگراں ہے تو فیصلہ کرو ان کے درمیان اس چیز کے مطابق جو اللہ نے اتاری ہے اور حق سے منحرف ہو کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔''

بعینہٖ یہی مضمون اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ، سورۂ انعام کی آیات ۱۳۶ سے لے کر ۱۵۳ تک بیان ہوا ہے اور آخری آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جماعت کی شیرازہ بندی اور تنظیم قانون و شریعت سے ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ وضع قانون و شرع کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا جائے جو سب کا خالق اور سب کا بادشاہ ہے۔ اگر اس حق میں دوسرے بھی شریک ہو جائیں اور ہر قوم و جماعت اپنے لیے قانون بنانے کی مجاز ہو جائے، تو اس کا لازمی نتیجہ بدنظمی، انتشار اور فساد فی الارض ہے۔

وَ اَنَّ ہٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡہُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمۡ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾ (الانعام:۱۵۳)

''اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے، پس اسی پر چلو اور مختلف راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے ہٹا دیں، یہ ہے جس کی تمھیں وصیت کی جاتی ہے تاکہ تم بچو۔''

توحید اور تشریع کا یہی تلازم سورۂ نحل کی آیات ۵۴، ۵۵ میں موجود ہے لیکن یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

ج: خود پرستی کی ایک نہایت اہم اور عام شکل یہ ہے کہ جو لوگ ایک مدت تک فارغ البالی اور خوش حالی کی زندگی بسر کر چکے ہوتے ہیں اور دولت و ثروت اور اکتسابِ علم و فن کے وسائل پر قابض رہتے چلے آتے ہیں، کچھ عرصہ کے توارث کے بعد، اس حالتِ امن و اطمینان کو وہ اپنا استحقاق ذاتی اور اپنے علم و قابلیت کا ثمرہ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ذہنی حالت فرد کی ہو یا جماعت کی، بس کی گانٹھ ہے، جس سے بے شمار مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی تہ میں اتر کر غور کیا جائے

تو یہ صریح شرک ہے کیوں کہ اس دنیا کے اندر جو کچھ ہے سب کا خالق اللہ ہے۔ تمام وسائل و ذرائع اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور ان وسائل و ذرائع پر ہم اپنے جن اعضا اور جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعے سے تصرف کرتے ہیں وہ سب بھی خدا ہی کا عطیہ ہیں:

هُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَكُمْ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ قَلِيْلاً مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ (الملک:۲۳)

”وہی ہے، جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور تمھارے لیے کان، آنکھ اور دل بنائے ہیں مگر تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔“

ہمارے عروج وکمال کا کوئی درجہ، ہمارے علم وفضل کا کوئی مرتبہ اور ہماری عظمت و سطوت کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے، جو ہمیں اس کی بندگی اور غلامی سے بے نیاز کر سکتا ہو، ہم سلیمان اور ذوالقرنین ہو کر بھی اس کے آگے ویسے ہی محتاج اور فقیر ہیں جیسے سلمان وابوذر ہو کر (رضی اللہ عنہما)۔ احتیاج وافتقار ہماری ایک صفت ذاتی ہے، جو کسی حال میں بھی ہم سے جدا نہیں ہو سکتی، خواہ ہم کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائیں اور قوت وسطوت کی کتنی ہی بڑی مقدار فراہم کر لیں۔

عرب جاہلیت میں شرک کی یہ قسم بھی موجود تھی۔ وہ اپنی خوش حالی اور فارغ البالی کو اپنے علم وتدبیر کا نتیجہ اور اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ سمجھتے تھے۔ آخرت کے اولاً قائل نہیں تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی تھے تو اس کے لیے عمل واطاعت کی کسی سرگرمی کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح ہم دنیا میں بہتر حالت میں ہیں اسی طرح آخرت میں بھی بہتر حالت میں رہیں گے۔ یہ بہتر حالت میں رہنا ہمارا ایک ذاتی حق ہے جو کسی حال میں ہم سے چھن نہیں سکتا۔ قرآن نے اسی ذہنی حالت کی تصویر کھینچی ہے۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

(الزمر:۴۹)

”جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے ہم کو پکارتا ہے پھر جب ہم اس کو نعمت بخش دیتے ہیں کہتا ہے یہ تو مجھے اپنے علم کی بدولت ملی ہے بلکہ یہ آزمائش ہے۔ لیکن اکثر نہیں جانتے۔“

بعض انسان کوئی چیز اپنے علم وقابلیت سے نہیں پاتا جو کچھ بھی پاتا ہے خدا کے فضل سے

پاتا ہے اور اس سے مقصود اس کی آزمائش ہوا کرتی ہے کہ وہ شکر کرتا ہے یا ناشکری۔ لیکن اکثر اس آزمائش سے ناواقف ہیں اور وہ ناشکری ہی کرتے ہیں اور جو چیز خدا کی عنایت سے ملتی ہے۔ اپنے علم و قابلیت کا ثمرہ اور اپنا ذاتی استحقاق سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح خدا کی ربوبیت اور رزّاقیت میں شریک بن بیٹھتے ہیں۔

یہ چیز استکبار اور فساد فی الارض کی جڑ ہے۔ اس متکبرانہ اور مشرکانہ ذہنیت کی تصویر دوسری جگہ اس طرح کھینچی ہے۔

وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْۤ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ (حٰمٓ السجدة:۵۰)

"اگر ہم اس کو چکھائیں رحمت بعد اس تکلیف کے جو اسے پہنچی، کہے گا یہ تو میرا حق ہے اور مجھے قیامت کے ہونے کا گمان نہیں ہے اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹنا ہی ہوا تو میرے لیے وہاں بھی اچھائی ہی اچھائی ہے۔"

یہی ذہنیت ہے، جس کا ذکر سورۂ مدثر میں ہے:

وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ وَّ بَنِيْنَ شُهُوْدًا ۙ وَّ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۙ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۙ (المدثر:۱۲-۱۴)

"اور ہم نے اس کو بہت سا مال دیا اور ساتھ دینے والے بیٹے دیے اور اس کی جڑ جمائی پھر وہ توقع رکھتا ہے کہ ہم آخرت میں بھی اس کو اور زیادہ دیں گے۔"

آخری ٹکڑے ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ (پھر توقع رکھتا ہے کہ میں زیادہ کروں گا) کا مطلب یہ ہے کہ وہ خیال کرتا ہے کہ اگر بالفرض خدا کے ہاں جانا ہی ہوا تو مجھے دنیا میں جو کچھ حاصل ہے اس سے زیادہ وہاں حاصل ہوگا کیوں کہ وہ اس تمام عظمت و ثروت کو اپنے استحقاق کا نتیجہ سمجھتا ہے اس کو خدا کی بخشش اور آزمائش نہیں سمجھتا، اسی ذہنیت کی تصویر سورۂ معارج میں ہے:

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۙ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۙ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۙ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ۙ (المعارج:۳۶-۳۹)

''ان کافروں کو کیا ہوگیا ہے کہ تمھارے اوپر داہنے بائیں سے گروہ در گروہ پلے پڑ رہے ہیں کیا ان میں سے ہر ایک یہ امید کیے بیٹھا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہوگا! ہر گز نہیں ہم نے ان کو اس چیز سے پیدا کیا ہے، جس کو وہ جانتے ہیں۔''

یہ تصویر ہے اُس حالت کی جو آں حضرت ﷺ کو دعوتِ قرآن کے وقت پیش آتی۔ اربابِ اقتدار کی ذلت اور جزا وسزا کی آیتیں جب آپ سناتے تو قریش کے سرداروں کو سخت چوٹ لگتی۔ ان کے لیے یہ تصور بہت شاق تھا کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے، جس میں بلندی اور پستی کی میزان ایمان اور عمل صالح کے ہاتھ میں ہوگی اور ایک غریب سے غریب کسان اور ادنیٰ سے ادنیٰ مزدور بھی اپنی بندگی اور اطاعت کے صلہ میں بڑے بڑے سرداروں کے لیے قابلِ رشک ہوگا۔ وہ جب قرآن کی یہ آیتیں سنتے تو ان کی تردید کرتے اور ان کا مذاق اڑانے کے لیے شوق میں ہر چہار طرف سے آپ پر پل پڑتے اور استحقاقِ ذاتی کے گھمنڈ میں جو ایک متوارث خوش حالی اور سیادت کا قدرتی نتیجہ ہے، یہ کہتے کہ اگر ہم خدا کے یہاں جائیں گے تو وہاں بھی ان کمینوں سے اچھے ہی رہیں گے۔ ہمیں جو کچھ حاصل ہے ہمارے استحقاقِ ذاتی کا ثمرہ ہے۔ یہ کسی جگہ بھی ہم سے چھن نہیں سکتا۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ ہم پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ حکومت کریں، عیش و آرام کریں اور لوگوں پر بلند و بالا رہیں۔ قرآن نے اس کا جواب دیا:

كَلَّا ۖ إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّمَّا يَعْلَمُونَ ○ (المعارج:۳۹)

''ہر گز نہیں ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں۔''

جس کو وہ جانتے ہیں، یعنی بتانے کی ضرورت نہیں ہے، اس کی بے حقیقی اور کم قدری ان پر اچھی طرح واضح ہے۔ نجس پانی کی ایک بوند کے لیے اپنی برتری اور پاکیزگی، اپنے استحقاقِ ذاتی و موروثی اور اپنے شرفِ نسبی و حسبی کا یہ غرور زیب نہیں دیتا۔ جس انسان کی تمام توانائیاں اور تمام قوتیں اور تمام قابلیتیں بچپنے اور بڑھاپے کی دو ناتوانیوں کے درمیان کھڑی ہوئی ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً ؕ (الروم:۵۴)

''اور اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ناتوانی سے، ناتوانی کے بعد قوت دی، اور پھر قوت کے بعد ناتوانی اور بڑھاپا دیا۔''

اس انسان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے تئیں بندگی سے بالاتر، عمل و اطاعت سے بے نیاز اور خدا کی خدائی میں حصہ دار خیال کرنے لگے۔

یہی حقیقت سورۂ نجم میں نہایت لطیف اسلوب سے بیان ہوئی ہے:

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ یَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی۝ اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ط اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ط هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ج فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۝ (النجم:۳۱، ۳۲)

”اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ جن لوگوں نے بدی کی ان کو ان کی بدی کا بدلہ دے اور جن لوگوں نے نیکی کی ان کو ان کی نیکی کا اچھا صلہ دے۔ یعنی ان لوگوں کو جو بڑے گناہ اور کھلی بدکاریوں سے بچتے رہے مگر کبھی اس کی چھوت لگ گئی بے شک تیرا رب وسیع بخشش والا ہے۔ وہ تمھیں خوب جانتا ہے جب کہ تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی صورت میں تھے، پس اپنی پاکیزگی کا دعویٰ مت کرو وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے، جنھوں نے پرہیزگاری اختیار کی۔“

اس سے اوپر والی آیت میں ملائکہ کی شفاعت کی تردید تھی۔ اس کے بعد جزا و سزا کا حق ہونا بیان کیا اور فرمایا کہ اللہ کے ہاں کی کامیابی صرف ان لوگوں کے لیے ہے، جو کبائر اور فواحش سے بچتے رہیں اور اگر کبھی اس طرح کی کسی گندگی پر پاؤں پڑ جائیں تو توبہ و استغفار کے اشک ندامت سے دھو ڈالیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو استحقاق ذاتی کے گھمنڈ میں مبتلا ہیں اور اپنے آپ کو بڑی چیز بلکہ پیدائشی حق دار جنت سمجھ رہے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ خدا ان کے اس وقت سے بھی واقف ہے، جب اس نے ان کو خاک سے پیدا کیا اور اس وقت سے بھی واقف ہے جب وہ پانی کی ایک بوند کی شکل میں اپنی ماؤں کے پیٹوں میں پڑے اور پھر ایک مضغۂ گوشت اور جنین کی صورت اختیار کی۔ ایسے ناتواں اور حقیر وجود کے لیے جس کی ابتدا اتنی ناچیز ہے، زیبا نہیں کہ وہ اپنی برتری کے غرور میں مبتلا ہو، جس کے پاس جو کچھ بھی ہے، سب خدا کی بخشش ہے،

ایک ذرّہ بھی اس کی قدرت وقابلیت کا نتیجہ نہیں ہے۔

اسی مشرکانہ ذہنیت کی تصویر سورۂ کہف میں ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا○ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّ فَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا نَهَرًا○ وَّكَانَ لَهُ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّأَعَزُّ نَفَرًا○ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا○ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا○ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَ هُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا○ لَٰكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا○ (الکہف:۳۲-۳۸)

’’ان کے لیے دو شخصوں کی تمثیل بیان کروان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ بنائے ان کو کھجور کے درختوں سے گھیرا اور اُن کے درمیان کھیتی اُگائی۔ دونوں باغ خوب پھل لائے کچھ کمی نہیں کی۔ ہم نے ان کے درمیان ایک نہر بنائی اس میں پھل آئے تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور وہ اس سے مفاخرت کررہا تھا، میں تم سے مال میں زیادہ اور جمیعت میں قوی ہوں اور اپنے باغ میں آیا اور وہ اپنی جان پر آفت لا رہا تھا اور بولا میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی برباد ہو سکے گا، اور میں قیامت کے ہونے کا بھی گمان نہیں رکھتا اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف جانا ہی ہوا تو اس سے بہتر ٹھکانا پاؤں گا، اس کے ساتھی نے جواب میں کہا کیا تم نے اس خدا کی ناشکری کی جس نے تجھ کو مٹی سے بنایا پھر پانی کی ایک بوند سے پھر ایک مرد بنا کر کھڑا کیا لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے، میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناؤں گا۔‘‘

ایک مفاخرت کی تصویر ہے، جو عرب کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی تھی اور جس کے لیے عربی ادب میں اصلاحی لفظ مفاخرت ہے۔ اس پر غور کیجیے تو ایک ایسے ذہن کے تمام مفاسد اس میں عریاں ہو گئے ہیں، جو استحقاق کے ذاتی گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ اس کے جواب میں

دوسرے بندۂ موحد نے بعینہٖ وہی بات کہی ہے جو اوپر سورۂ نجم اور سورۂ معارج والی آیتوں میں گزر چکی ہے۔ یعنی اس کی خلقت اور اس کی اصل کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس انسان کی اصل مٹی ہے، جو اپنی ابتدا میں صرف نجس پانی کی ایک بوند ہے اس کے لیے استحقاقِ ذاتی کا لفظ بالکل بے معنی ہے اور پھر نہایت خوبی کے ساتھ اس امر کو واضح کیا ہے کہ یہ استکبار اور یہ استحقاق ذاتی کا گھمنڈ درحقیقت شرک ہے، جو شخص اس غرور میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو خدائی میں شریک بناتا ہے اور پھر اپنے آپ کو اس شرک سے بری کیا ہے: لٰکِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا○ (بلکہ وہی اللہ میرا رب ہے اور میں کسی کو اپنے رب کا ساجھی نہیں ٹھیراؤں گا)۔

بعد کی آیت میں اس پرخود غلط مغرور کے باغ کی تباہی کا ذکر ہے اور اس کی حسرت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا○ (الکھف:۴۲)

''اے کاش میں کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ ٹھیراتا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دولت وثروت کی چکاچوند باقی رہی آنکھیں بند رہیں، اس وقت تک اپنی قوت وتدبیر پر ناز تھا، اپنی جمعیت وعصبیت پر فخر تھا، اپنے خدم وحشم کی کارفرمائیوں پر غرور تھا۔ لیکن جب باغ ویران ہوگیا اور نہ جمعیت وعصبیت کچھ کام آسکی نہ خدم وحشم کچھ کام آسکے۔ (وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا) تو ان تمام اصنام کی بے حقیقی اس پر واضح ہوگئی اور پھر اس نے افسوس کیا کہ ہائے میری کم بختی میں نے کیوں ان کو اپنے پروردگار کا شریک ٹھیرایا۔

جن ذہنوں کے اندر یہ گھمنڈ بسا ہوا ہوان کا بالکل غیر متوازن ہوجانا ایک بالکل قدرتی بات ہے۔ ان کی خدائی کی بنیاد ریت پر ہوتی ہے۔ جب خدا کی قدرت ان کو ذرا سا جھنجھوڑ دیتی ہے غرور اور گھمنڈ کی جگہ ان پر مایوسی ودل شکستگی چھا جاتی ہے۔ لیکن جوں ہی حالات بدل جاتے ہیں، سروسامان پھر بہم ہوجاتا ہے، قوت وشوکت کے جلوے پھر نظر آنے لگتے ہیں، نفس کے اندر کی دبی ہوئی خدائی پھر جاگ اٹھتی ہے اور وہ قرآن کے لفظوں میں فرح فخور (اکڑنے والے اور فخر کرنے والے) بن کر زمین میں پھر فساد پھیلانے اور خدا کی خدائی کی جگہ خدا کے بندوں

سے اپنی خدائی منوانے میں اپنا سارا زور روز رصرف کرنے لگتے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ حَتّٰی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ○ فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ (یونس:۲۲،۲۳)

''وہی ہے جو تم کو چلاتا ہے خشکی اور تری میں یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں سازگار ہوا سے چلیں اور وہ خوش ہوئے۔ آتی ہے ایک تند ہوا اور گھیر لیتی ہیں موجیں ہر سمت سے اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ اب ہلاک ہوئے تو اللہ کو پکارتے ہیں اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس ورطۂ ہلاکت سے نجات بخشی تو ہم شکر کرنے والوں میں سے ہوں گے۔ پھر جب ان کو نجات دے دیتے ہیں تو وہ زمین میں سرکشی کرنے لگتے ہیں بغیر کسی استحقاق کے۔''

یہی مشرکانہ ذہنیت ہے، جس کا ذکر سورۂ قصص میں ہے:

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْکَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ○ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ (القصص:۷۷،۷۸)

''خدا نے تجھ کو جو کچھ بخشا ہے اس میں دارِ آخرت کو طلب کر اور دنیا کے اندر سے اپنا حصہ نہ بھول اور احسان کر جیسا کہ اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے اور زمین میں فساد نہ چاہ اللہ فساد چاہنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اس نے کہا یہ سب کچھ تو میرے علم کی بدولت مجھے ملا ہے۔''

سورۂ فجر میں ہے:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰـهُ رَبُّهٗ فَاَکْرَمَـهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ فَیَقُوْلُ

رَبِّیۡۤ اَکۡرَمَنِ ۝ وَ اَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰہُ فَقَدَرَ عَلَیۡہِ رِزۡقَہٗ ۬ۙ فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَہَانَنِ ۝ (الفجر: ۱۵، ۱۶)

"لیکن انسان تو جب اس کو آزماتا ہے تو اس کا رب پس اس کو عزت دیتا ہے اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے میرے خداوند نے میری عزت کی اور جب اس کو آزماتا ہے اور اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔"

یعنی یا تو یہ سمجھ کر کہ میں لائق عزت ہوں اور جو کچھ مجھے ملا ہے میرے استحقاق کا نتیجہ ہے، مغرور و متکبر ہو جاتا ہے اور زمین میں اکڑنے اور فساد پھیلانے لگتا ہے یا بہ حالت دیگر یہ سمجھ کر کہ خدا نے مجھے بالکل نکما اور ذلیل بنا دیا، مایوس و نامراد ہو جاتا ہے اور عزت نفس کا وہ جوہر بھی کھو بیٹھتا ہے، جو سوسائٹی کے اندر اس کو ایک خوددار اور باوقار انسان کی جگہ دلا سکے۔

یہ عدم توازن محض اس غلطی کا نتیجہ ہے کہ انسان اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی اور اپنی تدبیر و قابلیت کا ثمرہ خیال کرنے لگتا ہے۔ یہ تصور ایک مشرکانہ تصور ہے۔ موحدانہ تصور یہ ہے کہ انسان عُسر اور یُسر، تنگی اور فراخی دونوں کو خدا کی طرف سے سمجھے، یہ دونوں میں اپنے لیے آزمائش خیال کرے۔ فراخی کے متعلق یہ خیال کرے کہ یہ شکر کی آزمائش ہے۔ تنگی کے متعلق یہ خیال رکھے کہ یہ اس کے صبر کا امتحان ہے۔ اِن دونوں حالتوں سے ایک بندے کا پورا دین امتحان کی کسوٹی پر جانچا جاتا ہے کیوں کہ دین درحقیقت صبر اور شکر ہی کے مجموعہ کا نام ہے، جس شخص کا تصور یہ ہوگا لازماً اس کا نفس متوازن رہے گا۔ نہ وہ مصائب میں گھبرائے گا اور نہ فراخی و کشادگی کے وقتوں میں مغرور و متکبر ہوگا۔ وہ جب دشمنوں کے نرغے میں ہوگا اور اس کے سر کے لیے بڑے بڑے انعاموں کا اعلان ہوگا تو عین اس وقت جب کہ آخری خطرہ بالکل سامنے ہوگا وہ اپنے ایک ہی ساتھی کو ان لفظوں میں تسلی دے گا۔ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے) اور عین اس وقت جب کہ ہزاروں انسانوں کی دل بادل فوج کے اندر اس پر ایک شہنشاہ اعظم کا دھوکہ ہو رہا ہوگا، اس کی مقدس پیشانی گھوڑے کی زین پر خدا کے آگے جھکی ہوئی ہوگی۔ ایسے متوازن نفس کے لیے قرآن نے نفس مطمئنہ کا لفظ استعمال کیا ہے:

يَآاَيَّتُهَا النَّفسُ الْمُطْمَئِنَّةُ○ ارجِعِیٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِيَةً مَّرضِيَّةً○ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ○ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ○ (الفجر:۲۷-۳۰)

''اے مطمئن دل تو لوٹ اپنے رب کی طرف خوش خوش اور پسندیدہ حالت میں اور شامل ہوجا میرے بندوں میں اور داخل ہوجا میری جنت میں۔''

༺༻

(۲)

اہلِ کتاب کا شرک

اہلِ کتاب کے دو گروہوں کا ذکر قرآن نے کیا ہے۔ یہود کا اور نصاریٰ کا۔ یہ لوگ آں حضرت ﷺ کی رسالت کے سوا اُن تمام اساساتِ دین کو تسلیم کرتے تھے، جن پر ایمان لانے کی دعوت قرآن دیتا تھا، یہاں تک کہ عقیدۂ توحید بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان مسلم تھا۔ نہ یہ لوگ اصول کے حد تک منکر تھے اور نہ توریت اور انجیل کی تصریحات کی موجودگی میں اس کا انکار ممکن تھا۔ لیکن اس مسلمہ پر ایمان رکھنے کے باوجود وہ بہت سے ایسے اعمال و معتقدات میں مبتلا تھے جو کفر اور شرک کو مستلزم تھے۔ قرآن نے اس مسلمہ کو اساس بحث قرار دے کر ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے اعمال و عقائد کو تناقض سے پاک کرلیں۔ یا تو توحید کا انکار کر دیں کہ اس کے لوازم کو تسلیم کرنے کی ذمے داری سے سبکدوش ہو کر جس وادی میں چاہیں ٹھوکریں کھائیں یا اس کے لوازم اور مقتضیات کو بھی تسلیم کریں اور اسی چراغ کو لے کر اپنے تمام اعمال و عقائد کا جائزہ لیں اور جو بدعات و مفاسد ان میں توحید سے بالکل متناقض پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کریں۔

یاد ہو گا عربوں سے بحث کا آغاز اس نقطہ سے ہوا تھا کہ جب آسمان و زمین کا خالق قوتوں اور قابلیتوں کا موجد، آسمانوں زمین کا مدبر خدا ہی ہے اور تمھیں ان مسلمات سے انکار نہیں ہے تو پھر ایسی باتیں کیوں مانتے ہو جو ان تمام مسلمات کے تار پود بکھیر دیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح ایک قدم آگے بڑھ کر اہلِ کتاب سے نفس عقیدۂ توحید کو مرکز قرار دے کر بحث کا آغاز ہوا کہ اگر یہ عقیدہ ہمارے اور تمھارے درمیان مانا ہوا ہے تو آؤ اسی کسوٹی پر اپنے کھرے کھوٹے کا امتحان کرلو۔ فرمایا:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○

(آل عمران: ۶۴)

"کہو اے اہلِ کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے کہ نہ بندگی کریں مگر اللہ کی اور نہ مستحق ٹھیرائیں اس کا کسی چیز کو اور نہ بنائیں کسی دوسرے کو اس کے سوا رب۔ پس اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو کہہ دو کہ ہم تو اللہ کے فرماں بردار ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی اللہ کی بندگی کرنا، کسی چیز کو اس کا شریک نہ ماننا، کسی کو خدا کے سوا رب نہ ٹھیرانا اہلِ کتاب اور مسلمانوں کے درمیان مسلم تھا۔ ان میں سے کسی ایک بات سے بھی نہ یہود کو اختلاف تھا اور نہ نصاریٰ کو اختلاف تھا۔ لیکن کسی کو رب نہ ماننے کا مفہوم وہ صرف یہ سمجھتے کہ کسی کو خدا کے سوا رب پکارا نہ جائے۔ ان کے نزدیک خدا کی ربوبیت میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا تھا کہ جو حقوق وصفات صرف خدا کے لیے مخصوص ہیں ان میں دوسروں کو بھی شریک کر دیا جائے۔ مثلاً تشریع اور قانون سازی اللہ تعالیٰ کے مخصوص اختیارات میں سے ہے اور کسی کے لیے بھی یہ بات جائز نہیں ہے کہ اس کے اس اختیار میں کسی قسم کی مداخلت کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی خدائی میں ساجھا بٹانے کی جرأت کا مرتکب ہوتا ہے اور اگر ہم خود اس کے لیے یہ حق تسلیم کرتے ہیں تو گو زبان سے ہم اس کو خداوند یا رب نہ کہیں۔ لیکن در حقیقت ہم اس کو خدا کی حاکمیت و ربوبیت میں شریک گردانتے ہیں مگر یہود و نصاریٰ خدا کے اس حق میں دوسروں کو شریک کرنے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے۔ چناں چہ قرآن نے اسی بنیاد پر یہود و نصاریٰ دونوں ہی کو اس امر کا مجرم قرار دیا کہ یہ اپنے علماء اور فقیہوں کو اللہ کے سوا رب ٹھیراتے ہیں:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰــهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

(التوبۃ: ۳۱)

"انھوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب ٹھیرالیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی حالاں کہ ان کو نہیں حکم دیا گیا ہے مگر اس بات کا کہ ایک ہی خدا کی بندگی کریں۔ وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں۔"

اس آیت سے متعلق، احادیث میں عدی بن حاتمؓ کا ایک سوال منقول ہے۔ انھوں نے آں حضرت ﷺ سے پوچھا یہود ونصاریٰ اپنے عالموں اور راہبوں کو رب تو نہیں کہتے! آپ نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں ان کو وہ حرام کرتے ہیں تو تم ان کو حرام قرار دیتے ہو اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے ان کو وہ حلال کر دیتے ہیں تو تم ان کو حلال قرار دیتے ہو؟ عدی بن حاتم نے کہا۔ ہاں یہ بات تو ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: فتاب عبادتهم 'یہی ان کی پرستش ہوئی'۔

اس سے معلوم ہوا کہ عدی بن حاتم کو یہ غلط فہمی تھی کہ جب تک زبان سے کسی کے خداوند ہونے کا اقرار نہ کیا جائے اس وقت تک وہ خدا اور رب نہیں ہوتا اور جب تک کسی کی رسمی عبادت نہ کی جائے اس وقت تک وہ معبود نہیں بنتا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اس غلط فہمی کا ازالہ یوں فرمایا کہ کسی کو خداوند کہو یا نہ کہو اگر وہ حقوق واختیارات اس کو دیتے ہو جو خدا کے لیے مخصوص ہیں تو بغیر اس کے کہ تم زبان سے اس کو رب اور الٰہ کہو اس کو رب مان رہے ہو اور بغیر اس کے کہ اس کی پوجا کے رسمی طریقے بجالاؤ اس کی پرستش کر رہے ہو، قانون اور شریعت بنانا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ اس منصب پر تم جس کو سرفراز کرو خداوند بن جائے گا اور تم اس کے بندے بن جاؤ گے۔ زبان سے اس کو بندہ کہو یا خدا۔

آیت کی صحیح توجیہ سمجھنے کے لیے یہ تشریح کافی ہے لیکن اس کی مزید وضاحت کے لیے چند مفید مطلب باتوں کا بیان کرنا ان شاء اللہ بے موقع نہ ہوگا۔

اس آیت میں یہود ونصاریٰ کے دو شرک بیان ہوئے ہیں۔ احبار ورہبان کو رب بنانا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کو رب بنانا۔ ہم ان دونوں چیزوں پر بالاجمال گفتگو کریں گے۔

الف۔ احبار پرستی

یہود کے متعلق یہ امر معلوم ہے کہ انھوں نے اپنی شریعت کی بہت سی باتیں فراموش کر دی تھیں: وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ (مائدہ: ۱۳)۔ بہت سے مقامات میں تحریف کر ڈالی تھی۔ مثلاً جہاں بنی اسمٰعیل کے اندر ایک نبی خاتم کی بعثت یا قبلہ ابراہیمی یا مقام قربانی وغیرہ کا بیان تھا۔ بہت سے احکام انھوں نے چھپا دیے تھے۔ بالخصوص جو زنا، سرقہ، قتل نفس وغیرہ کے حدود سے متعلق تھے، بہت سے احکام پر انھوں نے شرعی حیلوں کے پردے ڈال دیے تھے۔ بہت سے

فتویٰ قانونِ الٰہی کے بالکل خلاف محض اغراضِ دنیوی کے لیے لکھتے تھے۔اور پھر ان کے متعلق یہ دعویٰ کرتے تھے کہ یہ عین توریت کے احکام ہیں۔ یہ ساری باتیں قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی شریعت کے ان تمام گوشوں میں خدا کی حاکمیت بالکل معدوم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ان کے علما اور فقہا کے خود ساختہ احکام وقوانین نے لے لی تھی۔

اسی طرح بائبل ہسٹری اور یہود کے نظام قضا اور طریق قانون سازی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اجتہاد بالکل معدوم تھا۔ قبائل میں جو قاضی مقدمات کے فیصلہ کے لیے معمور تھے وہ نئے مسائل میں، جن کے بارے میں کوئی صریح حکم توریت میں موجود نہ ہوتا یہ نہیں کرتے تھے کہ توریت کے احکام اور اپنے نبی کے فیصلے سامنے رکھ کر اجتہاد کریں۔اور اسلام کے اصول کے مطابق خدا کی مرضی سے اوفق بات معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ معاملہ کو کاہن اعظم کے سامنے پیش کر دیتے۔ کاہن اعظم خدا کی مرضی معلوم کرنے کا ایک قدرتی ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔ کاہنِ اعظم یہ کرتا کہ وہ خیمہء عبادت میں، قدس الاقداس کے اندر جاتا جہاں تابوت ایک پردہ کے پیچھے رکھا ہوا ہوتا۔ یہ مقامِ الہام ربانی کا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس پر یہواہ (خدا) کے احکام الہام ہوتے۔ وہ ان احکام سے لوگوں کو مطلع کرتا اور لوگوں پر ان کی تعمیل واجب ہوتی۔ بنچلی اپنی کتاب دی تھیوری آف اسٹیٹ (The Theory of the state) میں مذہبی حکومت (تھیاکریسی) کے باب میں لکھتا ہے:

> ”قانونِ الٰہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا رہتا، جس کی دوکرہ بی حفاظت کرتے اور جس کی تعظیم الہام ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ تابوت خیمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے قدس الاقداس میں رہتا تھا اور کاہنوں کی طرف سے پورے اہتمام سے اس کی نگرانی ہوتی تھی۔ یہیں کاہنِ اعظم (یہواہ، خدا) کے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا۔“
>
> ”قاضی جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر مامور تھے۔ وہ یہ کام خدا کے نام سے انجام دیتے۔ کیوں کہ قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص تھا۔ اگر کوئی معاملہ ان کے سامنے ایسا آجاتا جن کا فیصلہ ان کے لیے مشکل ہوتا تو اس میں ان کے لیے ضروری ہوتا کہ لاویوں کے ذریعے سے خدا کی مرضی معلوم کریں۔“

یہ طریقہ ٹھیک بت پرست قوموں کی نقالی ہے اور یہودیت نے اپنے بگاڑ کے

زمانے میں اس کو اختیار کیا، جس طرح مصر، عراق، نینوا وغیرہ کے بت خانوں میں پجاری اور پروہت، کسی اہم ضرورت کے وقت اپنے معبودوں کے سامنے جا کر ہاتفِ غیب کی زبان سے، ان معبودوں کی مرضی معلوم کرتے تھے۔ یا جس طرح اہلِ عرب اپنے معبودوں کے سامنے فال کے تیروں کے ذریعے سے ان کے احکام اور فیصلے معلوم کرتے تھے، اسی طرح یہود نے بھی تابوت کو ایک معبود بنا لیا تھا، جس معاملہ میں ان کو مشکل پیش آتی، کاہنِ اعظم تابوت کے سامنے جا کر خدا کے احکام اور فیصلے معلوم کر لیتا۔ مجرد تابوت کے سامنے حاضری حصول الہام کے لیے کافی تھی۔ یہ کاہن معصوم اور ملہم خیال کیے جاتے۔ اس طریقہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نبی لاوی اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بن بیٹھے۔ اور ان کے ہر قسم کے خیالات و اوہام نے قانون و شریعت کا درجہ حاصل کر لیا۔

نصاریٰ کے ہاں صورت معاملہ اس سے بھی زیادہ بھونڈی ہے۔ نصاریٰ کی اصلی حیثیت یہود کے ایک اصلاح یافتہ فرقہ کی تھی نہ کہ ایک مستقل امت کی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے خود فرمایا ہے کہ میں توریت کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ اس کو پورا کرنے آیا ہوں۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ جب تک اس کی ساری باتیں پوری نہ ہولیں ایک نقطہ بھی اپنی جگہ سے ٹل نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کوئی نئی شریعت نہیں دی بلکہ اپنے پیرووں کو صرف روح دین کی تعلیم دی اور قوانین و شرائع میں اسی دین کی پیروی کا حکم دیا جو توریت میں موجود تھا۔ صرف یہود کی بدعات کی حد تک اس میں اصلاح فرمائی۔

نصاریٰ کی ابتدائی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں حضرت مسیح علیہ السلام کے خلفاء کی حیثیت یہی تھی۔ وہ احکام و شرائع میں تمام توریت کے متبع تھے لیکن پال نے مسیحیت کے تمام ظاہر و باطن کو بالکل مسخ کر ڈالا۔ اس نے نصاریٰ کو ایک مستقل نام اور ایک مستقل امت کی حیثیت سے ممیز کیا اور توریت کے احکام کی پابندی صرف بنی اسرائیل کے لیے خاص کر دی۔ غیر بنی اسرائیل کے لیے توریت کی پابندی منسوخ کر کے شراب اور سور وغیرہ کو جائز قرار دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے سچے خلفاء نے ان مسائل پر اس سے بڑے بڑے مباحثے کیے لیکن پال کی بدعات رومیوں وغیرہ کے مذاق کو اس قدر اپیل کرنے والی تھیں کہ بالآخر انھیں کو فروغ ہوا، اس طرح مسیحیت نے ایک مستقل امت کی حیثیت اختیار کر لی۔ لیکن

ایک ایسی امت کی جو کتاب و شریعت سے محروم ہے۔ کیوں کہ انجیل احکام سے بالکل خالی ہے اور توریت کی پیروی سے پال نے ان کو بری کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام معاملات زندگی میں نصاریٰ خدا کے بجائے اپنے علماء کی بدعات کے پیرو ہو گئے۔ علماء جو کچھ کہتے وہی خدا کا حکم بن جاتا۔ قسطنطین کے زمانہ سے جب سلاطین روم کی تلوار نے عیسائیت کی عداوت کی جگہ اس کی حمایت کا رنگ اختیار کیا، پوپ کی عظمت کا یہ حال ہوا کہ ایک طرف پوپ کے احکام روانہ ہوتے دوسری طرف بادشاہ کا فرمان جاری ہوتا کہ ان احکام کی خدائے قادر مطلق کے احکام کی حیثیت سے پیروی کی جائے بالآخر یہ لے اس درجہ بڑھی کہ مقدس علماء کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ یہ زمین پر جو باندھتے وہ آسمان پر بھی باندھا جاتا اور یہ زمین پر جو کھولتے وہ آسمان پر بھی کھولا جاتا۔ ان کی زبان خدا کی ترجمان بن گئی۔ یہاں تک کہ یہ زمین پر جس کو بخشش دیتے وہ آسمان پر بخش دیا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اللہ کے احکام کے پیرو نہیں بلکہ نعوذ باللہ خدا خود ان کے احکام کی تعمیل کرتا تھا۔

ب۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو رب بنانا

اسی طرح نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی رب بنالیا۔ عیسائیوں کے علم کلام اور مذہبی مباحث کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فتنہ کا بانی بھی پال ہی ہے۔ مسیح علیہ السلام کے شاگرد جیسا کہ معلوم ہے، غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ برعکس اس کے پال یونانی فلسفہ اور یونانی تصوف کا ماہر تھا۔ اس نے انجیل کی شرح ایک نئے رنگ سے پیش کی اور دعویٰ کیا کہ میرے لیے مسیح کے ان پڑھ شاگردوں کے الفاظ کی پیروی ضروری نہیں ہے جو حقائق و رموز کے سمجھنے سے بالکل قاصر تھے بلکہ میرا علم براہِ راست بطریق مکاشفہ خود مسیح سے ماخوذ ہے۔ لطف یہ ہے کہ پال عبرانی زبان سے جو انجیل کی اصلی زبان تھی بالکل ناواقف تھا۔ اس کا تعلق انجیل کی اصلی زبان کے ساتھ وہی تھا، جو ایک عجمی جاہل کا قرآن کی زبان کے ساتھ ہو سکتا ہے، جس طرح اسلام کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ دین میں بدعات کے فتنے پیشتر ان عجمیوں کی بدولت اٹھے، جو قرآن و حدیث کی اصل زبان سے عموماً ناواقف تھے اور ساتھ ہی ان کے دماغ عجمی فلسفہ و تصوف سے مسموم تھے۔ اسی طرح پال نے جو انجیل کی اصل زبان سے ناواقف اور یونانی فلسفہ و تصوف کا ماہر

تھا، انجیل اور نصرانیت کا بالکل ہیولا بدل ڈالا۔ اس پر باطنیت (Gnosticism) کا رنگ غالب تھا اور اس کی تمام سرگرمیوں میں جو چیز اصلی محرک کی حیثیت سے نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو رومیوں کے اندر عیسائیت کو مقبول بنائے۔ اس ذوق اور اس محرک کے ساتھ قدرتاً اس کو حضرت مسیح علیہ السلام کی اصلی زندگی اور ان کی واقعی تعلیمات سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی رغبت کی چیزیں وہی ہو سکتی تھیں جو اس کے فلسفۂ باطنیت کے ساتھ میل رکھتی ہوں اور جن کو آسانی کے ساتھ رومی میتھالوجی سے ہم آہنگ کیا جا سکے، چناں چہ اس کی ساری بدعتوں کے اندر اس کا یہ ذوق ابھرا ہوا نظر آتا ہے لیکن ہم یہاں صرف الوہیت مسیح کی بدعت کی کسی قدر وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

انجیل میں مسیح علیہ السلام کے لیے بیٹے (ابن) اور کلمۃ اللہ اور خدا کے لیے باپ (اب) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور ساتھ ہی جگہ جگہ ان کو ابن آدم بھی کہا گیا ہے۔ اور توحید کی بھی نہایت واضح لفظوں میں تعلیم دی گئی ہے۔ مسیح کے سچے شاگردوں کو ان باتوں کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں پیش آئی۔ عبرانی زبان میں ''ابن'' کا لفظ عبد اور بیٹے کے مفہوم میں مشترک ہے۔ اسی طرح ''اب'' کا لفظ باپ اور رب کے معانی میں مشترک ہے، ان کو نہ ابن کے لفظ سے کوئی دھوکا ہو سکتا تھا نہ ''اب'' کے لفظ سے۔ وہ بے تکلف ابن اللہ کا مفہوم عبداللہ اور ابی کا مفہوم ربی سمجھتے تھے اور بالفرض لفظ کے اشتراک کی وجہ سے اگر کوئی شبہ پیدا بھی ہو سکتا تھا تو توحید کی واضح تعلیمات اس کے دور کرنے کے لیے کافی تھیں، اہلِ حق کا طریقہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ مشتبہ چیزوں پر عقائد کی بنیاد نہیں رکھتے بلکہ ان کی تاویل واضح تعلیمات اور قطعی اصولوں کی روشنی میں کرتے ہیں۔ لیکن پال کے لیے انجیل کے ان ہی چند الفاظ نے تاویل بازی اور فتنہ سازی کا دروازہ کھول دیا۔ پال کا تمام تر مآخذ عبرانی سے ناواقفیت کی وجہ سے، یونانی انجیلیں تھیں۔ یونانی میں آکر 'اب' اور 'ابن' کے الفاظ اپنے مفہوم سے بالکل علیحدہ ہو گئے تھے، جن مفہوموں میں وہ عبرانی میں مستعمل تھے۔ یونانی میں صریحاً وہ باپ اور بیٹے کے مفہوم میں ہو گئے تھے۔ یہیں سے پال کے مذاق باطنیت کو غذا ملی۔ مسیح کو کلمۃ اللہ بھی کہا گیا تھا اور اسی کو اساس قرار دے کر اس نے یہ فلسفہ تراشا کہ کلمہ (Logos) ایک برتر تخلیقی روح کائنات (World Power) اور مسیح اس برتر تخلیقی روح کائنات کے مظہر (Incarnation) ہیں، بس یہیں سے مسیح کے ابن اللہ بلکہ اللہ

ہونے کی بدعت چل پڑی۔

پال ۶۴ء میں مرا ہے۔ اس وقت سے لے کر چوتھی صدی کے اوائل تک اس مسئلہ پر عیسائیوں کے درمیان جو ہنگامے برپا ہوئے اور اس بنیاد پر جو فرقے اُٹھے ان کی تفصیل طولانی ہے۔ لیکن اس عہد کی تاریخ کے طالب علم کو تین فرقے نمایاں طور پر نظر آئیں گے:

۱- آریوسی (Arians): یہ آریوس (Arius) کے پیرو تھے۔ اور مسیح کو مخلوق مانتے تھے۔

۲- سابیلی (Sabelliass): یہ حلول کے قائل تھے اور مسیح کو خدا کا ایک مظہر یا اس کا ایک رُخ (Aspect) کہتے تھے۔ ان کے نزدیک خدا ہی خالق منجی اور معزی سب کچھ تھا، جس طرح ایک ہی شخص باپ، مربی اور مہمان سب کچھ ہوسکتا ہے۔

۳- تثلیثی: ان کا لیڈر (Athanasian) تھا یہ لوگ عقیدۂ تثلیث کے داعی تھے۔

ان فرقوں میں سے آریوسی فرقہ صحیح نصرانیت کے بقایائے صالحہ میں سے تھا۔ اگرچہ دوسرے فرقوں کے دباؤ اور رجحان عام کے اثر سے یہ لوگ بھی بعد میں حضرت مسیح علیہ السلام کو مقام بشریت سے کچھ بالاتر خیال کرنے لگ گئے تھے، لیکن تثلیث یا حلول کی تردید میں اس فرقہ کی کوششیں بے نظیر ہیں۔

تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے اوائل میں ایک خاص واقعہ نے مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور عبدیت کے متعلق عیسائیوں کے تمام فرقوں کو بری طرح دست وگریباں رکھا تھا۔ اس وقت تک رومی شاہنشاہی کے اندر مسیحیت کافی پھیل چکی تھی اور یہ اختلافات سلطنت کے دشمنوں کے لیے سازگار ہوسکتے تھے اس وجہ سے قسطنطین نے مسیحیت کا قلع قمع کرنے کی وہ پالیسی، جو اس کے پیشرووں نے اختیار کر رکھی تھی ترک کر کے حمایت مسیحیت کی پالیسی اختیار کی۔ اس کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوئی کہ کسی طرح ان نبرد آزما اور متصادم فرقوں میں اتحاد کرائے تا کہ ان اختلافات کی وجہ سے سلطنت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس کے لیے سب سے پہلے ۳۱۴ء میں اس نے ارلیس میں چرچ کی ایک کونسل منعقد کی لیکن پیش نظر مقصد میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر ۳۲۵ء میں اس کے ایماء سے چرچ کی ایک جنرل کونسل نیسیہ میں منعقد ہوئی اور گو وہ اس وقت تک باضابطہ عیسائی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس نے کونسل کی صدارت کی۔ یہ کونسل نہایت اہم تھی۔ اس میں عیسائیت کے تمام فرقوں اور تمام کلیسوں کے ذمہ دار

نمائندے موجود تھے۔ اصلی معرکہ آریوسی فرقہ اور الوہیت مسیح کے معتقدین کے درمیان تھا۔ اس کونسل کی روداد نہایت دلچسپ ہے، جس وقت بوڑھا آریوس مسیح علیہ السلام کے مخلوق ہونے پر تقریر کرنے کھڑا ہوا، ایک شخص نے اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا اور بہت سے بشپ اور پادری کانوں میں انگلیاں دیے ہوئے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ ہم اس بڈھے پھوس کی کفریات کی تاب نہیں لاسکتے۔ کونسل کی اکثریت آریوس کے خلاف تھی اس وجہ سے اس کی پارٹی اور اس کے دوسرے حامیوں کو شکست ہوئی۔ کونسل نے کئی دن کی بحث وتمحیص کے بعد کثرتِ رائے سے مسیحی عقیدہ مندرجہ ذیل الفاظ میں مرتب کیا جو (Nicene Creed) کے نام سے موسوم ہوا اور مسیحی عقائد کے باب میں، چوتھی صدی سے لے کر آج تک مسلّم اور سب سے اہم دستاویز ہے۔

> ''ہم ایک خدا پر ایمان لاتے ہیں جو باپ ہے اور قادرِ مطلق، تمام چیزوں کا خالق تمام حاضر وغائب کا، اور وہ ایک خداوند یسوع مسیح پر ایمان رکھتے ہیں، ابن اللہ، خدا کا (جنا ہوا) اکلوتا، باپ کے جوہر سے خداوند خدا، نور النور، عین خدا سے عین خدا، جنا ہوا، بنایا ہوا نہیں، باپ ہی کے جوہر سے، جس نے تمام چیزیں بنائیں، آسمان اور زمین میں، جو ہم آدمیوں کے لیے اور ہماری نجات کے لیے اُترا مجسم شکل انسانی، اس نے دکھ اٹھایا پھر تیسرے دن جی اٹھا، اور آسمان پر چڑھ گیا، مردوں اور زندوں کی عدالت کے لیے پھر آئے گا اور ہم روح القدس پر ایمان لاتے ہیں۔''
>
> ''پر وہ جو کہتے ہیں کہ پہلے وہ نہ تھا اور جیے جانے سے پہلے وہ معدوم تھا۔ اور وہ عدم سے وجود میں آیا۔ یا جو کہتے ہیں کہ خدا کا بیٹا دوسری شے یا دوسرے جوہر سے ہے، یا مخلوق ہے یا بشر ہے وہ کیتھولک اور رسولی چرچ کی طرح سے مردود ہیں۔''

نیسیہ کی کونسل کے بعد سے یہی عقیدہ مسیحی دنیا کا اصلی عقیدہ ہے اس میں آریوس اور اس کے ساتھیوں کی علانیہ تکفیر کردی گئی ہے۔ اس کونسل کے بعد سے یہ صرف چرچ ہی کا نہیں بلکہ اسٹیٹ کا بھی مذہب بن گیا اور اس کی تائید کے لیے حکومت کی تلوار بھی بے نیام ہوگئی۔ اس وجہ سے آریوس کے بہت سے ساتھیوں نے بھی اس کی تائید ہی میں امان دیکھی۔

کس قدر حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ جن عیسائیوں نے پوری تین صدیاں، انسانوں کی خدائی کے انکار کے جرم میں، سلاطین روم کے دل ہلا دینے والے مظالم وشکنجہ میں گزاریں، تلواروں سے قیمہ کیے گئے، آگ میں بھونے گئے، درندوں سے نُچوائے گئے لیکن

انسانوں کی خدائی سے برابر انکار کرتے رہے، وہی عیسائی، نیسیہ میں جمع ہوکر، ایک کافر بادشاہ کی رہنمائی میں، مسیح کی خدائی کے محضر پر اس عزم و جزم کے ساتھ اپنی مہر تصدیق ثبت کردیتے ہیں!

اس کونسل کے بعد کونسلوں پر کونسلیں منعقد ہوئیں اور بعد کی صدیوں میں بھی برابر منعقد ہوتی رہیں، بہت سے جزئی اختلافات بھی پیش آئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ آریوس کے حامیوں نے زور بھی پکڑلیا۔ یہاں تک کہ قسطنطین کے جانشینوں میں سے بھی بعض نے آریوسی عقیدہ اختیار کرلیا۔ لیکن یہ سب عارضی اور وقتی جزرومد تھے۔ مرکزیت اسی عقیدہ کو حاصل رہی جو اوپر مذکور ہوا اور مشہور گبن کے لفظوں میں اب اسی عقیدہ کے اسرار و رموز کو حل کرنے کا نام مسیحیت رہ گیا ہے۔

عیسائیوں کے یہی وہ مشرکانہ عقائد ہیں، جن کی قرآن نے نہایت تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے۔ ہم بعض آیتیں نقل کرتے ہیں:

وَ قَالَتِ الۡیَہُوۡدُ عُزَیۡرُۨ ابۡنُ اللّٰہِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَی الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ قَوۡلُہُمۡ بِاَفۡوَاہِہِمۡ ۚ یُضَاہِـُٔوۡنَ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ قٰتَلَہُمُ اللّٰہُ ۚ۫ اَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ۝ (التوبۃ:۳۰)

''یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے منہ کی بات ہے ان لوگوں کی مشابہت کرتے ہیں جنھوں نے ان سے پہلے کفر کیا۔ اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں بھٹک گئے ہیں۔''

ذٰلِکَ قَوۡلُہُمۡ بِاَفۡوَاہِہِمۡ یہ ان کے منہ کی بات ہے، یعنی اللہ نے نہیں فرمائی ہے، یہ ان کی اپنی من گھڑت ہے، کتابِ الٰہی میں اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ یُضَاہِـُٔوۡنَ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ اپنے سے پہلے کافروں کی مشابہت کرتے ہیں، یعنی بے سوچے سمجھے اپنے اگلوں کی بات دہراتے ہیں اور قرآن کی توضیح و تشریح کے بعد بھی غور نہیں کرتے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

ان ہی لوگوں کو مخاطب کرکے دوسری جگہ فرمایا ہے:

یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ غَیۡرَ الۡحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوۡۤا اَہۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَ اَضَلُّوۡا کَثِیۡرًا وَّ ضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ ۝ (المائدۃ:۷۷)

''اے اہل کتاب (نصاریٰ) اپنے دین میں حق سے ہٹ کر غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی

بدعات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے گمراہ ہوئے اور جنھوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور جو وسط راہ سے بھٹک گئے۔''

یعنی اس تمام فساد کی جڑ آباء پرستی ہے، جو ضلالت اگلوں سے چلی آرہی ہے، بے سوچے سمجھے اسی کی پیروی کر رہے ہیں اور اندھی تقلید نے ان کو صحیح تعلیم کی طرف توجہ کرنے سے محروم کر دیا ہے۔

بعض آیات میں ان کے شرک کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک حقیقت کے اعتبار سے کفر ہی ہے۔ دین میں صرف خدا کو ماننا معتبر نہیں ہے بلکہ اس کو جمیع صفات کے ساتھ ماننا معتبر ہے۔ اس لیے وہ ماننا جو اس کی تمام صفات کے ساتھ نہ ہو، جیسا کہ مشرکین مانتے ہیں، درحقیقت نہ ماننے کے حکم میں ہے۔

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ‌ؕ قُلۡ فَمَنۡ يَّمۡلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـئًا اِنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّهۡلِكَ الۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا‌ؕ وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا‌ؕ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ○ (المائدۃ:۱۷)

''ان لوگوں نے کفر کیا جو کہتے ہیں اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے۔ کہہ دو کون اللہ کے مقابل میں کسی چیز پر اختیار رکھتا ہے اگر وہ ارادہ کرے کہ ہلاک کردے مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو اور ان سب کو جو زمین میں بستے ہیں۔ اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین اور ان چیزوں کی بادشاہی ہے، جو ان کے درمیان ہیں۔ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس آیت میں مخاطب وہ لوگ ہیں جو حضرت مسیح کو خدا کا اوتار مانتے تھے۔ چوں کہ الوہیت مسیح کی ایک بہت بڑی دلیل ان کی خارق عادات ولادت بھی تھی۔ اس وجہ سے آیت کے آخری حصہ میں اس کی تردید کی ہے۔

اس خیال کی تردید قرآن نے مختلف جگہ مختلف طریقوں سے کی ہے۔ بعض جگہ ان کو حضرت آدمؑ سے تشبیہ دی ہے کہ بن باپ کے پیدا ہونا اگر دلیل الوہیت ہے تو آدم کو بھی الٰہ ہونا چاہیے۔ بعض سورتوں میں حضرت یحیٰی علیہ السلام کی ولادت کو حضرت مسیح علیہ السلام کی سرگزشت

کا مقدمہ قرار دیا ہے کہ اگر عام اسباب کے خلاف پیدا ہو جانا ہی خدا بن جانے کی دلیل ہے تو مرد کی پیری اور عورت کے بانجھ پن کے باوجود کسی لڑکے کی ولادت بھی خلافِ عادت ہے۔ پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کو خدا کیوں نہیں مانتے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ ... مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ (المائدۃ: ۷۲-۷۵)

”بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا، جنھوں نے کہا کہ اللہ تو وہی مسیح بن مریم ہیں حالاں کہ مسیح نے تعلیم دی ہے کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے۔ بے شک جو اللہ کا ساجھی ٹھیرائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا آگ ہوگا اور ظالموں (مشرکوں) کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ بے شک ان لوگوں نے کفر کیا، جنھوں نے کہا اللہ تین کا تیسرا ہے۔ نہیں ہے، کوئی معبود مگر ایک ہی... نہیں ہے مسیح ابن مریم مگر ایک رسول، اس سے پہلے بہت سے انبیاء گزر چکے ہیں اور اس کی ماں صدیقہ تھی اور دونوں کھانا کھاتے تھے۔“

اس آیت میں حلول اور تثلیث دونوں کے قائلین کی تردید ہے اور ان دونوں فرقوں کے دعوے کے خلاف خود مسیح علیہ السلام کی تعلیم یہ نقل کی گئی ہے کہ:

اُعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ (المائدۃ: ۷۲)

”اللہ ہی کی بندگی کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے۔“

انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول جو بار بار نقل ہوتا ہے کہ میرا باپ اور تمھارا باپ، قرآن نے اس کی ٹھیک ٹھیک تعبیر یہ بتائی ہے کہ وہ درحقیقت میرا رب اور تمھارا رب فرماتے تھے۔ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ عبرانی میں اب کا لفظ باپ اور رب کے مفہوم کے لیے مشترک ہے۔

آیت کے آخر میں ماں اور بیٹے دونوں کے کھانا کھانے کو بھی ان کی بشریت کی دلیل

کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کھانا کھانا بشریت کی ایک ایسی دلیل ہے، جو بنی اسرائیل میں مسلّم تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جو فرشتے آدمیوں کی شکل میں آئے تھے، انھوں نے ان کے سامنے کھانا پیش کیا لیکن جب انھوں نے کھانے کی طرف التفات نہیں کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فوراً اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ بشر نہیں ہیں بلکہ فرشتے ہیں۔

انجیل لوقا میں ہے کہ ایک مرتبہ خود مسیح علیہ السلام نے بھی کھانا کھا کر اپنے حواریوں کو اپنی بشریت کا یقین دلایا، اٹھالیے جانے کے بعد جب وہ دوبارہ اپنے شاگردوں کے پاس آئے تو شاگران کو دیکھ کر بہت گھبرائے اور ان کی باتیں سن کر یہ گمان گزرا کہ کوئی روح ان سے باتیں کر رہی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کے اس وہم کو جس طرح دور کیا، اس کی تفصیل انجیل میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

> ''اس نے ان سے کہا تم کیوں گھبراتے ہو اور کس واسطے تمھارے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں۔ میرے ہاتھ، میرے پاؤں دیکھو میں ہی ہوں مجھے چھو کر دیکھو کیوں کہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی جیسا کہ مجھ میں دیکھتے ہو اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے جب مارے خوشی کے ان کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے ان سے کہا یہاں تمھارے پاس کچھ کھانے کو ہے انھوں نے اسے بھونی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔ اس نے لے کر ان کے روبرو کھایا۔'' (لوقا ۲۴۔۲۹۔۴۳)

اس سلسلے میں قرآن کریم کی وہ عظیم سورہ بھی پڑھ لینی چاہیے، جو نصاریٰ کی مشرکانہ ضلالتوں کی سب سے زیادہ جامع تردید ہے۔ یعنی سورۂ اخلاص:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○ (۱-۴)

> ''کہہ وہ اللہ بے ہمہ ہے۔ اللہ باہمہ ہے۔ نہ وہ باپ ہے نہ وہ بیٹا ہے۔ نہ کوئی اس کی برابری کا ہے۔''

اس سورہ کے ایک ایک لفظ کا صحیح وزن سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ اوپر نیسیہ کی کونسل کا مرتب کیا ہوا مسیحی عقیدہ جو ہم نقل کر آئے ہیں، اس کے الفاظ پر غور کر کے ایک مرتبہ اور پڑھ لیجیے اس کے تقابل سے اندازہ ہو سکے گا کہ یہ سورہ اس عقیدۂ ضلالت کی ایک ایک اصل کو کس طرح ڈھا رہی ہے۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانہ میں نصاریٰ کو اس سورہ سے اس قدر چڑھ

رہی ہے کہ اگر وہ کسی کو اپنے مذہب میں داخل کرتے تھے تو اس سے نعوذ باللہ اس خدا پر لعنت کرواتے تھے، جس کی صفت اس سورہ میں بیان کی گئی ہے۔

یہاں تک احبار ورہبان اور حضرت مسیح علیہ السلام کو رب بنانے کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، لیکن قرآن نے اہلِ کتاب کو بعض دوسرے اقسامِ شرک کا بھی مجرم قرار دیا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِیْمًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ۝ اُنْظُرْ كَیْفَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِیْنًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ یَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ۝ (النساء: ۴۷-۵۱)

”اے لوگو! جن کو کتاب ملی ہے، ایمان لاؤ اس چیز پر جو ہم نے اتاری ہے مطابق اس چیز کے جو تمھارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم مٹا دیں چہروں کو پس پھیر دیں ان کو پیچھے یا ان پر لعنت کر دیں، جس طرح سبت والوں پر لعنت کر دی۔ اور خدا کی بات شدنی ہے، بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا ساجھی ٹھیرایا جائے اور اس کے سوا جو کچھ ہے اس کو بخش دے گا، جس کے لیے چاہے اور جو کوئی اللہ کا ساجھی ٹھیرائے گا تو اس نے بہت بڑا گناہ کھڑا کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی پاکی کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ اللہ پاک کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے اور ذرا بھی ان کے ساتھ کمی نہ کی جائے گی۔ دیکھو کس طرح اللہ پر جھوٹا بہتان لگاتے ہیں اور کھلا ہوا گناہ ہونے کے لیے یہ کافی ہے۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جن کو کتاب کا ایک حصہ ملا وہ ایمان لاتے ہیں، جبت اور طاغوت پر اور کہتے ہیں کافروں کو یہ ایمان والوں سے زیادہ راہ یاب ہیں۔“

ان آیات میں اہلِ کتاب کے لیے قرآن پر ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ یہ

دھمکی بھی ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو مستحق ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے چہرے مسخ کردے اور جس طرح سبت کی حرمت برباد کرنے والوں پر لعنت کی گئی اسی طرح ان پر بھی لعنت کردی جائے۔ آنکھ، کان، دماغ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ سے فائدہ اٹھانے کے لیے بخشی ہیں۔ اگر کوئی قوم ان چیزوں کو رکھ کر ان سے فائدہ نہیں اٹھاتی اور خدا کی آیتیں نہ اس کو دکھائی دیتی ہیں نہ سنائی دیتی ہیں تو وہ مستحق ہے کہ ان نعمتوں سے محروم کردی جائے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک کو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا، البتہ اس کے علاوہ جو گناہ ہیں ان کو جس کے لیے چاہے گا معاف کردے گا۔ پھر اہلِ کتاب کے تین شرک گنائے ہیں: (۱) اپنی پاکی اور برتری کا دعویٰ (۲) ایمان بالجبت والطاغوت (۳) حمایت شرک۔ یہاں ہم ان تینوں کی شرح کریں گے۔ لیکن طوالت سے بچنے کے لیے اختصار کو پیشِ نظر رکھیں گے۔

ج - اپنی پاکی و برتری کا دعویٰ

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ ؕ "ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جو اپنی پاکی کا دعویٰ کرتے ہیں۔" سے یہود و نصاریٰ کے اس خیال کی طرف اشارہ ہے، جس کا ذکر قرآن شریف میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:

وَ قَالَتِ الۡیَھُوۡدُ وَالنَّصٰرٰی نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلۡ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمۡ بِذُنُوۡبِکُمۡ بَلۡ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ مِّمَّنۡ خَلَقَ ؕ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ (المائدۃ:۱۸)

"اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔ پوچھو پھر خدا تمھیں گناہوں کے بدلہ میں سزا کیوں دیتا ہے؟ بلکہ تم بھی خدا کی مخلوق کے عام آدمیوں کی طرح ہو۔ وہ بخشے گا، جس کو چاہے گا اور سزا دے گا، جس کو چاہے گا۔"

سورۂ جمعہ میں ہے:

قُلۡ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ ھَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّکُمۡ اَوۡلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۝ (الجمعۃ:۶)

"کہہ دو اے لوگو جو یہودی ہوئے اگر تمھارا خیال ہے کہ تم اللہ کے دوست ہو لوگوں کے علاوہ۔ تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔"

اوپر مشرکین کے بیان میں خود پرستی کے عنوان سے ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس مقام کو سمجھنے کے لیے اس پر ایک نظر ڈال لینا مفید ہوگا۔ مشرکین اور اہلِ کتاب کے قلوب میں مشابہت کا ذکر قرآن نے کئی جگہ کیا ہے۔ یہ بھی اسی مشابہت کی ایک قسم ہے، جس طرح مشرکین، خانۂ کعبہ کی بدولت ایک عرصہ تک مرجعِ خلائق بنے رہنے اور امن و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے رہنے کی وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ جو کچھ انھیں حاصل ہے، ان کے استحقاق ذاتی کا ثمرہ، ان کے حسب و نسب کا لازمی نتیجہ اور ان کے علم و تدبر کا کرشمہ ہے۔ وہ اسی حال میں رہے ہیں اور اسی حال میں رہیں گے۔ یہ عزت یہ سیادت، یہ سربراہی ان کے لیے ابّ وجد کی چھوڑی ہوئی میراث ہے، جو ان سے چھن نہیں سکتی۔ ان کے باپ دادا ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام اپنی نیکیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کی قیمت ادا کر چکے ہیں اور اب ان کو کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ٹھیک اسی طرح اہلِ کتاب بھی ایک عرصہ کی متوارث عظمت دینی و دنیاوی کی مسند پر متمکن رہنے کی وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہو گئے تھے کہ قوموں کی سربراہی اور قیادت ان کا فطرتی اور قدرتی منصب ہے، جس پر وہ اس لیے سرفراز کیے گئے ہیں کہ قوموں کی سربراہی اور قیادت ان کا فطرتی اور قدرتی منصب ہے، جس پر وہ اس لیے سرفراز کیے گئے ہیں کہ وہ خدا کی برگزیدہ مخلوق ہیں اس کے محبوب اور چہیتے ہیں اور اس کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد ہیں۔

توریت وغیرہ میں جو عزتیں اور بزرگیاں صفات و اخلاق کے ساتھ وابستہ کی گئی تھیں وہ تمام کی تمام انھوں نے اپنی قوم اور اپنی نسل کے ساتھ خاص کر دیں۔ اس خبط میں پڑ جانے کے بعد ان کا سارا اعتماد اس بات پر رہ گیا کہ وہ ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کی اولاد ہیں اور ان اکابر کی اولاد میں ہونا ہی خدا کے یہاں تقرب اور اس کی پکڑ سے نجات کے لیے کافی ہے۔ عمل و اطاعت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یہیں سے ان کو یہ خیال بھی پیدا ہو گیا کہ جہنم کی آگ ہمیں چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ ہمیشگی کی جہنم ہمارے لیے نہیں ہے۔ یہیں سے یہ خبط بھی ان کو پیدا ہو گیا کہ دنیا کو دین و ایمان کی روشنی اب صرف ہمارے ہی واسطہ سے مل سکتی ہے، کوئی دوسری قوم اس کا وسیلہ نہیں بن سکتی۔ قوم ہماری قوم ہے، نبی ہمارا نبی ہے اور ہدایت صرف ہماری ہدایت ہے۔ جو ہمارے اندر ہے وہ راہ یاب ہے جو ہم سے باہر ہے وہ گمراہ ہے۔

یہود کے اس غرہ کی بنا پر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تم اولادِ ابراہیم میں

ہونے سے گھمنڈ نہ کرو، خدا ابراہیم کے لیے زمین کے ذرّوں سے اولاد پیدا کرسکتا ہے۔ قرآن نے ان کے یہ سارے خیالات سورہ بقرہ وغیرہ میں نقل کیے ہیں اور ان کو امانی (جھوٹی آرزوئیں)، ظنون (بے بنیاد خیالات) اور زخرف القول (ملمع کی ہوئی باتیں) وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، اور ان میں سے ایک ایک وہم کی تردید کی ہے۔ اور ان خیالات ہی کی بنا پر ان کو ہدایتِ الٰہی کی پیروی سے محروم قرار دیا، ان کو رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کا مجرم ٹھیرایا، یہاں تک کہ ان کو اسلام، خدا کی بندگی اور اخلاص (یعنی توحید) سے بھی محروم قرار دیا۔ اور ان کی دعوت كُونُوا هُودًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوا (یہودی ہو جاؤ یا نصاریٰ راہ یاب ہوگے) کی جگہ امت وسط یعنی مسلمانوں کا کلمہ یہ بتایا:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ○ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ○ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ○ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَ هُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ○

(البقرہ:١٣٦-١٣٩)

”کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو اتاری گئی، ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر اور جو دی گئی موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اور جو ملی نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ پس اگر وہ ایمان لائیں، جس طرح تم ایمان لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعتراض کریں تو وہ جھگڑے میں پڑے ہوئے ہیں اور تمھاری طرف سے اللہ ان کے لیے کافی ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ اللہ کا رنگ ہے اور اللہ سے رنگ میں کون بہتر ہے اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں کہو کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو حالاں کہ وہی

ہمارا رب ہے، اور وہی تمھارا رب بھی ہے اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال ہیں ہم اسی کے لیے خالص ہیں۔''

اس آیت میں:

نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ○	ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔
نَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ ○	ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔
وَ نَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ ○	ہم اسی کے لیے خالص ہیں۔

کے الفاظ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں۔ ان تینوں میں اہل کتاب پر تعریض ہے کہ نہ تو تم مسلم ہو، نہ خدا کی بندگی کرنے والے ہو، نہ موحد ہو، جو خدا کا فرماں بردار، خدا کا بندہ وغلام اور صرف اللہ واحد ہی کا ماننے والا ہوگا وہ اپنے تئیں خدا کے رنگ میں رنگے گا، یہودیت یا نصرانیت کے رنگ سے کیوں ملوث ہوگا؟ وہ اللہ کی ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ جس شکل اور جس زبان میں بھی آئے اور سب نبیوں پر ایمان لائے گا۔ خواہ وہ کسی قوم میں مبعوث ہوئے ہوں وہ یہ نہیں کرے گا کہ کسی کو مانے اور کسی کا انکار کردے۔ یہ ساری باتیں اخلاص اور توحید کے منافی ہیں، یہ تم خدا کی بندگی نہیں کررہے ہو۔ بلکہ اپنی اپنی قوم کی اور اپنے اپنے نبی کی پرستش کررہے ہو۔

یہ آیت ان مسلمانوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے جو الگ الگ اماموں کی عصبیت میں گرفتار ہیں اور اپنے ہی گروہ کے امام یا علماء کے اندر حق وہدایت کو محصور مانتے ہیں، انھیں سوچنا چاہیے کہ اگر کسی ایک نبی یا انبیاء کی کسی ایک ہی جماعت پر جم جانا اور دوسروں کا انکار کردینا جائز نہیں ہے اور یہ اخلاص وتوحید کے منافی ہے تو کسی ایک امام یا علماء کی ایک ہی جماعت کے اندر حق کو محدود کردینا خدا پرستی، اتباعِ ہدیٰ، اللہ وسنت رسول اللہ اور توحید کی روح سے کس طرح ہم آہنگ ہوسکتا ہے۔

د - ایمان بالجبت والطاغوت

جبت سے مراد سحر، شعبدے، گنڈے تعویذ، ٹونے ٹوٹکے اور رمل جفر وغیرہ ہیں۔

بائبل ہسٹری اور یہود کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے کلدانیوں کے تمام علوم سفلیہ سیکھ لیے تھے۔ یہ چیزیں تاریخ کے ہر عہد میں اہلِ مذاہب کے لیے فتنہ بنی ہیں۔ مذہب کی سیدھی سادی بلکہ کڑوی کسیلی تعلیمات جب بے مزہ معلوم ہونے لگتی ہیں اور نفس

چٹخاروں کی تلاش میں ہوتا ہے تو یہ چیزیں رواج پا جاتی ہیں۔ یہ چیزیں مذہب کی اصلی روح کی موت کی نشانی ہیں، جس دن یہ فتنے کسی قوم میں ظاہر ہونے شروع ہوئے وہی دن مذہب کی پاک تعلیم کے زوال کا روزِ اول ہوتا ہے، جو لوگ ان چیزوں میں منہمک ہوتے ہیں کتابِ الٰہی سے ان کا تعلق ٹوٹ جانا لازمی ہے۔ ان دونوں کے سرچشمے دو ہیں ایک کا مصدر و منبع شیطان ہے اور دوسرے کا سرچشمہ رحمان ہے۔ جو لوگ شیطان سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں ان کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ خدا سے کٹ جائیں اور نبیوں کی تعلیم اور اللہ کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیں۔ چناں چہ یہود کا یہی حال ہوا، سورۂ بقرہ میں اُن کی اسی جبت پرستی کا ذکر ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ (البقرۃ:۱۰۱،۱۰۲)

”اور جب آیا ان کے پاس ایک رسول اللہ کے پاس سے مطابق اس چیز کے جو ان کے پاس ہے، تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے جن کو کتاب ملی، اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا گویا وہ علم رکھتے ہی نہیں اور پیروی کی اس چیز کی جو شیاطین سلیمان علیہ السلام کے عہد میں پڑھتے تھے اور سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور اس چیز کی پیروی کی جو بابل میں دو فرشتوں پر ہاروت ماروت پر اتاری گئی۔“

طاغوت، بروزن ملکوت و جبروت طغیٰ کے مادہ سے ہے، جس کے معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ جو چیز حد مناسب سے آگے بڑھ جائے اس کے لیے عربی میں کہیں گے طغی مثلاً طغی الماء پانی حد سے آگے بڑھ گیا، قوم ثمود جس آفت سے ہلاک ہوئی اس کے لیے قرآن میں طَغِيَة کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی آفت کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ حدود عبدیت و بندگی سے نکل جانے کے لیے استعمال ہوا اور جو چیز حدود بندگی

سے نکل جائے اس کو طاغوت کہنے لگے۔ پھر وہ چیزیں بھی اس کے تحت آگئیں جو حدودِ بندگی سے نکل جانے کا باعث یا ذریعہ ہوں۔ اہلِ لغت اسی وجہ سے اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

الطّاغوت عبادة عن کل متعد و کل معبود من دون اللّٰہ

"طاغوت سے مراد ہر وہ شے ہے، جو حد سے نکل جائے اور ہر وہ معبود ہے، جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے۔"

قرآن نے اس لفظ کو مختلف مقامات میں استعمال کیا ہے اور ہر جگہ اس کے مقابل کا ذکر کر کے اس کے مختلف مفہوموں پر روشنی ڈال دی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے:

فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ یہاں اللہ کے تقابل سے واضح ہے کہ طاغوت سے مراد ماسوا اللہ ہے۔ سورۂ نحل میں ہے: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ سورۂ نساء میں ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ اس کے بعد فرمایا۔ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ جس سے متعین ہوگیا کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے اور شیطان سے مراد شیاطین الانس والجن دونوں ہیں اور قرآن میں غیر الٰہی دعوت و اطاعت کے لیے یہ ایک جامع تعبیر ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ اس لفظ کو کتابِ الٰہی اور طریقۂ رسول کے ضد کے لیے استعمال کیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ وَ یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا○ وَ اِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَ اِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا○ (النساء:۶۰-۶۱)

اس آیت میں یَتَحَاکَمُوْنَ اِلَی الطَّاغُوْتِ کے بالمقابل تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَ اِلَی الرَّسُوْلِ کہہ کر واضح کر دیا کہ طاغوت کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول کی ضد کے لیے ایک جامع تعبیر ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو خدا کی بندگی و اطاعت سے نکل جائے یا نکل جانے کا باعث یا ذریعہ ہو، وہ سب طاغوت کے حکم میں داخل ہے۔ پس شیطان، ساحر، کاہن، اصنام و

اوثان، فرعون اور نمرود، اللہ کی ہدایت سے ہٹانے والے لیڈر، غیر الٰہی حکومتیں، غیر الٰہی عدالتیں، غیر الٰہی درس گاہیں، اور غیر الٰہی خانقاہیں سب اس کے تحت آتی ہیں۔ اور اہلِ کتاب شرک کی اس قسم میں بھی مبتلا تھے: مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيۡهِ وَ جَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَ الۡخَنَازِيۡرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوۡتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ۝ (المائدۃ: ٦٠)

د۔ حمایت شرک

اہل کتاب کا تیسرا شرک حمایت شرک ہے۔ شرک کی حمایت خواہ کسی نوعیت سے ہو شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو اپنی کتاب عنایت فرمائی تھی۔ ان سے اپنی شریعت کی پابندی کا عہد لیا تھا۔ ان کے اوپر آئندہ مبعوث ہونے والے نبی کی حمایت و تائید اور لوگوں سے اس کا تعارف کرانے کی ذمے داری ڈالی تھی۔ یہود سے کہا گیا تھا کہ ”میں ان کے لیے ان کے بھائیوں کے اندر سے ایک نبی تیرے مانند برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور میں جو کچھ اس سے کہوں گا وہ ان کو بتائے گا۔“ (تثنیہ) حضرت مسیح علیہ السلام اپنے حواریوں سے صاف صاف فرما گئے تھے کہ ”مجھے تم سے بہت ساری باتیں کہنی تھیں لیکن ابھی تم ان کا تحمل نہ کرسکو گے۔ لیکن جب وہ روح حق آئے گا تو سارے حق کی طرف تمھاری رہ نمائی کرے گا۔“ (یوحنا) یہود کو اس نبی کی بعثت کا انتظار بھی تھا اور وہ اپنے یہاں کی پیشین گوئیوں کے مطابق یقین رکھتے تھے کہ یہ نبی ان کی سعادت کا فتح باب ہوگا۔ اور ان کو کفار پر فتح دلائے گا: ”وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا۔ اور نصاریٰ تو گویا یکسر چشم انتظار ہی تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے انجیل میں جو مثلیں بیان فرمائی ہیں اگر ان کی تشریح کردی جائے تو معلوم ہوگا کہ امثالِ انجیل کا بڑا حصہ آخری بعثت کی سرگزشت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ ان حالات کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ اہلِ کتاب کا اصلی فریضہ یہ تھا کہ جب آخری بعثت ظہور میں آتی، اپنے سابق علم کی روشنی میں اس کو جانچتے پرکھتے، اگر اس کو اپنی پیشین گوئیوں کے مطابق پاتے، اس پر ایمان لاتے، لوگوں میں اس کو پہچنواتے، اس کی حمایت و تائید کرتے اور پھر اس کے لائے ہوئے دین کی اقامت کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کردیتے۔ لیکن ان لوگوں کا حال وہی ہوا جو مسیح علیہ السلام نے کنواریوں والی تمثیل میں بیان فرمایا ہے کہ رات بھر تو وہ اپنی مشعلیں جلائے ہوئے دولہا

کا انتظار کرتی رہیں لیکن جب دولھا کے آنے کا وقت ہوا تو ان کی مشعلیں بجھ گئیں، ان کی کپیوں کا تیل ختم ہو گیا اور وہ خود سو گئیں۔ صدیوں تک تو یہ لوگ منتظر رہے لیکن جب اس کا ظہور ہوا اور ان لوگوں نے ان کو پہچان بھی لیا تو ایمان کے بجائے اس کے انکار میں سبقت کی اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ حسد و عناد کے جوش میں کھلم کھلا ان مشرکین کی حمایت و نصرت میں کھڑے ہو گئے، جو اس دعوت کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ علی الاعلان اس کی تعلیمات کا مذاق اڑایا۔ اس کے کام کو روکنے کے لیے جنگیں برپا کیں اور اس عداوت کے جوش میں اس حد تک اتر آئے کہ مشرکین کے دین کو اس کی دعوت پر ترجیح دینے اور کفار کو اس کے پیروؤں سے زیادہ برحق اور ہدایت یافتہ بتانے لگے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا۝ (النسآء:۵۱) ''کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔'' اس شرک دوستی کے ساتھ توحید کے ساتھ کسی لگاؤ کی کہاں گنجائش رہتی ہے؟ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا۝ (النسآء:۵۲) ''ایسے ہی لوگ ہیں، جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔''

(۳)

منافقین کا شرک

جہاں تک ظاہری اعتقاد و عمل کا تعلق ہے منافقین پورے مسلمان تھے۔ ایمان کے جتنے اجزاء ہیں ان سب کا ان کو اقرار تھا۔ آں حضرت ﷺ اور دوسرے تمام انبیاء کی رسالت بھی ان کو تسلیم تھی۔ کلمۂ شہادت بھی وہ پڑھتے تھے۔ مسجدوں میں اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ پر نمازیں بھی ادا کر لیتے تھے۔ زکوٰۃ بھی دے دیتے تھے۔ خانہ کعبہ کا حج بھی کر آتے تھے۔ غزوات میں بھی شریک ہو جاتے تھے بلکہ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک زبانی اظہار کا تعلق ہے جہاد کا ولولہ بہ مقابلہ سچے مسلمانوں کے زیادہ ظاہر کرتے تھے اور ایمان بالرسالت کی ظاہرداریوں کا تو یہ عالم تھا کہ آں حضرت ﷺ کے پاس آتے اور قسمیں کھا کھا کے یقین دلاتے کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں لیکن ان ساری باتوں میں سے ان کی ایک بات بھی قرآن نے تسلیم نہیں کی، بلکہ ان کو ایمان سے محروم، رسالت کا منکر، شیطان کا ساتھی، جہنم کے سب سے نچلے طبقہ کا مستحق اور صاف صاف لفظوں میں شرک کا مجرم قرار دیا۔

تمام آیتوں کا استقصا اس مختصر مضمون میں مشکل ہوگا۔ لیکن ان کے شرک سے متعلق چند آیتیں ہم نقل کر کے ان پر بالاجمال گفتگو کریں گے۔ قرآن نے منافقین کو تحاکم الی الطاغوت کا مجرم قرار دیا ہے۔ اور اس تحاکم الی الطاغوت کو شرک بتایا ہے۔

الف ۔ تحاکم الی الطاغوت

سورۂ نساء میں فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ

اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَ قَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ وَ یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّہُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ○ وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡکَ صُدُوۡدًا ○ (النساء:۶۰،۶۱)

''کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جن کا گمان ہے کہ وہ اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصلے کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں، حالاں کہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بالکل گمراہ کر ڈالے اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف آؤ تو تم دیکھتے ہو منافقوں کو کہ تم سے اعراض کرتے ہیں۔''

اس سے اوپر والی آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ، رسول اور اپنی جماعت کے اولوالامر کی اطاعت کرو اور اگر کسی امر میں اختلاف واقع ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ اس کے بعد منافقین کا حال بیان فرمایا ہے کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے مدعی ہونے کے باوجود چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں، اللہ اور اس کے رسول کی عدالت میں نہ لائیں۔

اوپر ہم لفظ طاغوت کے مفہوم پر بحث کر چکے ہیں۔ اس آیت میں طاغوت کے بالمقابل:

تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ

''آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف۔''

کے الفاظ آئے ہیں، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طاغوت سے مراد وہ حکام ہیں، جن کے فیصلے کتابِ الٰہی اور رسول کے فیصلوں کے خلاف ہوتے ہیں اور آیات کے سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہاں اس سے مراد اہل کتاب کے حکام اور ان کی عدالتیں ہیں۔ یہ اس عہد کا حال بیان ہوا ہے، جب مدینہ میں بالفعل دار الاسلام قائم ہو چکا تھا۔ اور مسلمانوں کے تمام معاملات از قسم حدود و تعزیرات خود آں حضرت ﷺ کی عدالت میں پیش ہو کر طے پانے اور نافذ ہونے لگے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ایک متوازی حکومت (Parallel Govt.) یہود کی پہلے سے قائم اور ہنوز

موجود تھی۔ اس نظام کی موجودگی کی وجہ سے ایک پیچیدگی یہ پیدا ہو رہی تھی کہ منافقین اپنے بہت سے نزاعی امور میں ان یہودی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کے ایسا کرنے کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ یہود کے حکام کو رشوتیں دے کر ان سے اپنے موافق فیصلے حاصل کر لینا نہایت آسان تھا اور آں حضرت ﷺ کی عدالت میں اس چیز کا کوئی امکان نہیں تھا۔

دوسری یہ کہ منافقین کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ ابھی مدینہ کی اسلامی حکومت بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ ہر چند قریش کی طاقت اس نے توڑ دی ہے لیکن یہود کی منظم جماعت سے اس کی ٹکر ابھی براہِ راست نہیں ہوئی ہے۔ ممکن ہے کل کو یہ تصادم واقع ہو اور جیت یہود کی رہے تو تھوڑا بہت لگاؤ جو آج ان کے ساتھ رہے گا وہ کل کام آئے گا۔ ورنہ یہودی مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ ہمارا بھی خاتمہ کر دیں گے۔ اس ظنِ فاسد کی وجہ سے یہ لوگ اپنے معاملات زیادہ تر ان ہی کی عدالتوں میں لے جاتے۔ البتہ اگر کوئی معاملہ ایسا ہوتا، جس میں وہ سمجھتے کہ اسلامی عدالت میں فیصلہ کرانا مفید رہے گا تو نہایت فرماں بردارانہ آں حضرت ﷺ کی عدالت میں حاضر ہوتے۔

دوسری طرف یہود یہ شرارت کرتے تھے کہ تعزیرات و حدود کے اہم معاملات میں، جن میں وہ کسی ذاتی یا سیاسی مصلحت کی وجہ سے اپنی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرنا چاہتے، فریقین معاملہ کو یہ مشورہ دیتے کہ اس کو آں حضرت ﷺ کی عدالت میں لے جائیں۔ اور ساتھ ہی ان کو یہ ہدایت بھی کر دیتے کہ اگر محمد (ﷺ) یہ فیصلہ کریں تو مان لینا اور اگر کچھ اور فیصلہ کریں تو ہمارے پاس لوٹ آنا۔ اس طرح کے معاملات عموماً دولت مند یہودیوں کے ہوتے تھے۔ جن سے بھاری بھاری رشوتیں لے کر علمائے یہود شریعتِ الٰہی کی تنفیذ سے بچنے کی یہ شکل اختیار کرتے تھے کہ اگر آں حضرت ﷺ کی عدالت میں فیصلہ حسبِ منشاء ہوا تو مقصد حاصل اور ذمے داری آں حضرت ﷺ کی ہوتی اور اگر فیصلہ خواہش کے خلاف ہوتا تو اس کو چھوڑ کر خود اپنی عدالت میں اپنی منشاء کے مطابق فیصلہ کرتے۔

مذکورہ بالا آیت اور اس کی مشابہ آیات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے اس شانِ نزول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

ان منافقین کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ تحاکم الی الطاغوت یعنی غیر اسلامی عدالتوں میں اپنا معاملہ لے جانا اور پھر قرآن اور اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرنا دو متناقض چیزیں ہیں۔

ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے۔ اور الا اللہ کے اثبات سے پہلے لا الٰہ کی نفی ناگزیر ہے۔ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ ۢ بِاللّٰهِ ”پس جو کفر کرے طاغوت کا اور ایمان لائے اللہ پر۔“ دوسری جگہ ہے: اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ”اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو۔“ ایمان باللہ اور ایمان بالطاغوت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہود کی عدالتوں میں اگر اپنے معاملات لے جاتے ہو تو تمھارا ایمان بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا دعویٰ ایک زعم باطل ہے۔ ایمان بما انزل اللہ کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ تمام معاملات میں اللہ ہی کی اطاعت کی جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انبیاء کے راستے کی پیروی کی جائے اگر ایسا نہیں ہے تو نہ ایمان باللہ ہوا نہ ایمان بما انزل اللہ ہوا نہ ایمان بالرسول ہوا۔ رسول صرف اس لیے نہیں ہوتا کہ اعتقاد کی حد تک یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ رسول ہے بلکہ وہ اطاعت کے لیے ہوتا ہے اور خدا کی اطاعت کی راہ اس کی اطاعت کے اندر ہی سے ہو کر نکلی ہے۔ چناں چہ بعد کی آیات میں فرمایا:

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّ تَوْفِيْقًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا ۢ بَلِيْغًا ۝ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النساء: ۶۲-۶۵)

”پس کیا ہوگا جب پہنچے گی ان کو کوئی مصیبت ان کے کیے کے بدلہ میں، پھر وہ آئیں گے تمھارے پاس قسم کھاتے ہوئے کہ خدا کی قسم ہم نے تو بہتری اور موافقت چاہی تھی۔ ان لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے، اللہ اس کو خوب جانتا ہے پس ان سے منہ پھیر لو، ان کو زجر کرو اور ان سے ان کے بارے میں وہ بات کہو جو ان کے دل میں دھنسے۔ ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس کے لیے اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے

حکم سے اور اگر وہ جب کہ انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تمھارے پاس آتے، اللہ سے مغفرت مانگتے اور رسول ان کے لیے استغفار کرتا تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔ پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہیں جب تک کہ وہ ان امور میں جو ان کے درمیان پیدا ہوں تم ہی کو حکم نہ بنائیں۔ پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلے کی وجہ سے کوئی تنگی بھی نہ پائیں اور پوری اطاعت نہ کریں۔"

مذکورۂ بالا آیات میں وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے) خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہے۔ یہ منافقین کے اس زعمِ باطل کی تردید ہے کہ وہ تَحَاكُمْ اِلَى الطَّاغُوْتِ کے باوجود اپنے تئیں مومن باللہ اور مومن بالرسول سمجھتے ہیں۔ رسول صرف اس لیے نہیں آیا کرتا کہ زبان سے اس کی رسالت کا اقرار کرلیا جائے یا دل میں یہ عقیدہ رکھ لیا جائے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ بلکہ وہ اس لیے آتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ جملہ امور میں اس کو حکم مانا جائے۔ اس کے احکام کی بے چوں چرا تعمیل کی جائے۔ اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالے کردیا جائے۔ اس کے احکام کی بے چوں اور جو لوگ ان کے بتائے ہوئے راستے سے الگ ہیں ان سے بغاوت کی جائے۔ چناں چہ اس آیت میں قسم کھا کر فرمایا کہ اگر جب تک یہ لوگ اپنے تمام معاملات میں رسول کی حکومت تسلیم نہ کرلیں، اس کے فیصلوں کو دل کی پوری رضامندی کے ساتھ نہ مانیں اور اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں اس کے امر و نہی کے تابع نہ ہو جائیں اس وقت تک یہ مومن باللہ نہیں ہیں، مومن بالطاغوت ہیں۔

اوپر ہم نے جو باتیں بیان کی ہیں ممکن ہے ان کے بارے میں کسی کو شبہ ہو کہ آیات کا شانِ نزول (پس منظر) متعین کرنے میں ہم نے محض اپنے تخیل سے کام لیا ہے، ان کے اطمینان کے لیے ہم ان کو مائدہ کی آیات ۴۱ - ۵۴ کا حوالہ دیتے ہیں، جو لوگ ان آیتوں پر تدبر کریں گے وہ ان ساری باتوں کا ماخذ خود قرآن میں پا جائیں گے، جو ہم نے بیان کی ہیں۔ ان آیات کا مطلب اختصار کے ساتھ ہم اپنے لفظوں میں یہاں بیان بھی کیے دیتے ہیں تاکہ مراجعت میں آسانی ہو۔

"پہلے رسول کو تسلی دی ہے کہ منافقین اور یہود آپ سے معاملات کا فیصلہ کرانے کے بعد جو اس سے اعراض کرتے ہیں، تو اس سے غمگین نہیں ہونا چاہیے۔ یہ یہودی جو

اپنے معاملات کبھی کبھی آپ کے پاس لاتے ہیں تو یہ جھگڑا چکانے اور مقدمہ کا فیصلہ کرانے کے لیے نہیں لاتے۔ بلکہ یہ تو جھوٹ کے خریدار اور سرداران یہود کے ایجنٹ ہیں۔ وہ خود سامنے نہیں آتے، بلکہ پیچھے بیٹھے ہوئے، ان کٹھ پتلیوں کو نچاتے ہیں اور اللہ کے دین میں کتر بیونت کرتے ہیں اور آپ کے پاس ان کو یہ سکھا کر بھیجتے ہیں کہ اگر تمھارے معاملہ کا یہ فیصلہ ہو تو واپس چلے آنا۔ ایسے لوگوں کی حالت پر غم کرنا عبث ہے۔ اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں ہے کہ ان کے دلوں کو پاک کرے ورنہ توریت کی ہدایت کے مطابق یہ لوگ آپ پر ایمان لاتے اور کفر کے بجائے ایمان و اطاعتِ الٰہی کی طرف سبقت کرتے، ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔ یہ جھوٹ کے ماننے والے اور رشوت کے کھانے والے ہیں۔ اگر آپ کے پاس یہ اپنا معاملہ لائیں، تو آپ کو اختیار ہے کہ ان کے معاملہ میں پڑیے یا نہ پڑیے۔ ہاں اگر پڑیے تو لازم ہے کہ اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلہ کیجیے۔"

"اس کے بعد چند آیتوں میں یہود کو ملامت کی ہے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں کہ آپ کو حکم بناتے ہیں۔ پھر آپ کے فیصلے سے مکر جاتے ہیں حالاں کہ ان کے پاس توریت موجود ہے، جس میں اللہ کا قانون موجود ہے اور انھیں معلوم ہے کہ آپ کا فیصلہ قانونِ الٰہی کے خلاف نہیں ہے۔ پھر گزشتہ انبیاء اور علماء صالحین کا یہ طریقہ بتایا کہ وہ اس کتاب کے مطابق تمام معاملات کے فیصلے کرتے تھے پھر فرمایا کہ ان کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ دین کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت اور خیانت کو راہ نہ دیں گے اور شریعت کو کسبِ دنیا کا ذریعہ نہ بنائیں گے۔ بلکہ ہر حال میں کتابِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں گے اور اگر اس کی خلاف ورزی کریں گے تو کافر ہوں گے۔ اس کے بعد توریت کے قانونِ قصاص کا حوالہ دیا ہے، کیوں کہ یہود کی اصلی مداہنت حدود اور قصاص وغیرہ کے معاملات ہی میں تھی۔ اس کے بعد اہلِ انجیل کا ذکر فرمایا کہ ان کو بھی ہدایت کی گئی تھی کہ شریعتِ الٰہی کے مطابق فیصلے کریں گے اور اگر اس کے خلاف کریں گے تو فاسق ٹھہریں گے۔"

"پھر قرآن کا ذکر فرمایا کہ یہ کتاب توریت و انجیل کی پیشین گوئیوں کے مطابق اور ان کی تحریفات اور ملاوٹوں کی اصلاح کرنے والی ہے۔ پس آپ کا فرض ہے اگر ان کے کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا ہو اس کے مطابق کیجیے اور ان کی بدعات کی جو انھوں نے اپنی کتاب میں ملا رکھی ہے ہرگز پیروی نہ کیجیے۔ ان کے ایمان و ہدایت کا سوال آپ سے

نہ ہوگا ان کا اپنا جو طریقہ ہے اسی پر جامد ہو گئے ہیں اور اس کی عصبیت میں ایسے اندھے ہو گئے ہیں کہ آپ کی پیروی نہیں کریں گے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت کے راستہ پر کر دیتا لیکن جبر کرنا اس کی سنت کے خلاف ہے۔ اس نے اختیار بخشا ہے اور جس کو جو کچھ دیا ہے اس میں اس کی آزمائش کی ہے کہ دیکھے کون نیکی اور اطاعت کی راہوں میں بڑھتا ہے اور کون عصبیت جاہلیت کی حماقت میں مبتلا ہو کر اپنے طریقے اور ڈھرے ہی کو معبود بنا لیتا ہے۔''

''اس کے بعد مسلمانوں کی طرف توجہ فرمائی اور خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جو یہود سے ساز باز رکھتے تھے اور اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے تھے۔ ان کو یہود و نصاریٰ سے قطع تعلق کا حکم دیا اور فرمایا کہ جو لوگ ان کو اپنا مددگار بنائیں گے ان کا شمار ان ہی میں ہوگا۔ پھر صاف لفظوں میں منافقین کا ذکر فرمایا کہ ان کو اندیشہ ہے کہ اگر یہود اور مسلمانوں میں ٹکر ہوئی اور یہود فتح مند رہے تو یہ پس جائیں گے اس لیے یہ اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں تاکہ ان کی پارٹی میں سمجھے جائیں۔ پھر فرمایا کہ اے مسلمانو، جو تم میں سے اپنے دین سے مرتد ہو جائیں گے تو اللہ کو ان کی کچھ پروا نہیں اللہ اس کے بعد ایسے لوگوں کو لائے گا، جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔ وہ مومنوں کے لیے نرم خو اور بردبار ہوں گے اور کافروں کے لیے سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔''

یہ ساری تفصیل ہم نے محض یہود کی اس وقت کی سیاست اور ان کے ساتھ منافقین کے تعلقات کی نوعیت سمجھانے کے لیے بیان کی ہے تاکہ تحاکم الی الطاغوت کا صحیح تصور ذہنوں کے سامنے آسکے اور یہ واضح ہو سکے کہ منافقین اس سے کیا فوائد پیش نظر رکھتے تھے اور پھر یہ معلوم ہو سکے کہ کس طرح یہ ایک ہی چیز دین کے تمام اقرارات و اعترافات کو ڈھا دینے اور تمام عبادتوں اور طاعتوں کو سوخت کر دینے والی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن نے نہایت صاف لفظوں میں اس کو دین سے ارتداد قرار دیا ہے۔ اور اعلان فرمایا ہے کہ خدا کو ایسے لچلچے، ایسے مریض القلوب اور ایسے بزدل اور نفع پرست لوگوں کی ضرورت نہیں ہے، جو یہود کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح ناچیں۔ اس کو صرف ایسے لوگوں سے محبت ہے، جو اپنی سیرت میں چٹان کی طرح ٹھوس اور اپنے عزم و ارادہ میں لوہے کی طرح مضبوط ہوں۔ جو اسلام میں مصلحت پرستی اور نفع پرستی کے بت توڑ

کر داخل ہوئے ہوں اور بغیر کسی تقسیم کے اپنی پوری زندگی اللہ کے حوالہ کریں (اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃ)۔ جو لوگ صرف فوائد کی حد تک خدا کے پرستار رہنا چاہتے ہیں وہ اپنے لیے جو دین چاہیں پسند کر لیں، اللہ اور اس کے دین کو ان کی ضرورت نہیں ہے: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَہٗ خَیْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِہٖ وَ اِنْ اَصَابَتْہُ فِتْنَۃُ نِ انْقَلَبَ عَلٰی وَجْھِہٖ o (الحج:۱۱) ''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں، جو اللہ کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں اگر ان کو بھلائی پہنچتی ہے تو مطمئن رہتے ہیں اور اگر کوئی آزمائش پہنچتی ہے تو الٹے پھر جاتے ہیں۔''

توضیح مطلب اور شرح کے لیے سورۂ نور کی یہ آیتیں بھی سامنے رکھیے:

وَ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِکَ ط وَ مَآ اُولٰٓئِکَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ o وَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مُّعْرِضُوْنَ o وَ اِنْ یَّکُنْ لَّھُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْٓا اِلَیْہِ مُذْعِنِیْنَ o اَفِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ وَرَسُوْلُہٗ ط بَلْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ o اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ط وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ یَخْشَ اللّٰہَ وَ یَتَّقْہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ o وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ لَئِنْ اَمَرْتَھُمْ لَیَخْرُجُنَّ ط قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ج طَاعَۃٌ مَّعْرُوْفَۃٌ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ م بِمَا تَعْمَلُوْنَ o قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْہِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَیْکُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَ اِنْ تُطِیْعُوْہُ تَھْتَدُوْا ط وَ مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ o وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ

خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ وَ مَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۝ (النور: ۴۷-۵۵)

''اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور رسولؐ پر اور ہم نے اطاعت کی، پھر ایک فریق اس عہد کے بعد پھر جاتا ہے اور یہ لوگ مومن نہیں ہیں اور جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تا کہ ان کے درمیان معاملات کا فیصلہ کرے، تو ان میں سے ایک فریق جھٹ منہ پھیر لیتا ہے اور پھر حق انھیں کو ملنے والا ہو تو بڑی رغبت سے آتے ہیں۔ ان کے دلوں میں بیماری ہے یا وہ شک میں پڑے ہیں یا ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول اُن کے معاملہ میں ناانصافی کریں گے، بلکہ یہی لوگ اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔ اہل ایمان کا قول تو جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں، یہ ہوتا ہے کہ ہم نے سنا اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور اللہ سے ڈریں اور بچیں وہی لوگ کامیاب ہیں۔ اور اللہ کی پکی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر تم ان کو حکم دو گے جہاد کا تو وہ ضرور نکلیں گے کہہ دو قسم مت کھاؤ اور دستور کے مطابق اطاعت مطلوب ہے، اللہ تمھارے عمل کی خبر رکھنے والا ہے، کہہ دو اور رسول کی اطاعت کرو۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو اس پر (نبی پر) اس کی ذمے داری (یعنی تبلیغ) ہے اور تم پر تمھاری ذمے داری ہے (یعنی ایمان واطاعت) اور اگر تم اطاعت کرو گے تو راہ یاب ہو گے اور رسول پر صرف کھلے طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور بھلے کام کیے ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا، جس طرح کہ ان کے اگلوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا ہے محکم کرے گا اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا وہ میری بندگی کریں گے اور کسی کو میرا ساجھی نہیں ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو وہی لوگ فاسق ٹھہریں گے۔''

جن لوگوں نے ایمان کا مطلب صرف چند چیزوں پر اعتقادی ایمان سمجھ رکھا ہے ان کو ان آیات پر غور کرنا چاہیے۔ منافقین ان سب چیزوں پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے۔ لیکن قرآن نے ان کے اس اعتراف واعتقاد کو تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ صاف صاف فرمایا کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں، یہ ایمان واسلام کیسا کہ اپنے جملہ معاملات میں اللہ ورسول کی حکومت نہیں تسلیم کرتے، جب اپنا فائدہ ہوتا ہے تب تو رسول کے پاس دوڑے ہوئے آتے ہیں، لیکن جب اندیشہ ہوتا ہے کہ

رسول کے فیصلہ میں ان کا دنیوی خسارہ ہے تو یہود کی عدالت میں اپنا معاملہ لے جاتے ہیں کہ ان کی رشوت خوری اور مداہنت سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے۔ یہ اسلام کے غلبہ کی طرف سے مشتبہ ہیں، انھیں اللہ اور رسول کے عدل پر بھروسہ نہیں ہے۔ پھر واضح الفاظ میں فرمایا کہ مومن صرف وہ لوگ ہیں، جو اپنے تمام معاملات اللہ ورسول کی عدالت میں پیش کریں۔ اور یہاں سے جو فیصلہ ہو اس کو بے چوں و چرا تسلیم کریں۔ آخری آیت کے الفاظ خصوصیت کے ساتھ غور کے قابل ہیں، سچے مسلمانوں کو بشارت دی ہے کہ منافقین اسلام کے غلبہ کی طرف سے شبہ میں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے علی الرغم اہل ایمان کو غلبہ دے گا۔ دین حق کا بول بالا کرے گا اور یہود اور مشرکین کی وجہ سے جو خوف و اندیشہ کی حالت ابھی قائم ہے۔ اس کو جلد امن و اطمینان سے بدل دے گا اور ہمارے یہ خالص بندے صرف ہماری ہی بندگی کریں گے، کسی کو ہمارا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ یہ منافقین پر تعریض ہے کہ یہ لوگ غیر اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور اللہ کا ساجھی ٹھہراتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ تعریض محض اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، جو لوگ عبادت کے مفہوم میں اطاعت کو داخل نہیں سمجھتے اور خیال کرتے ہیں کہ اگر نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور روزے رکھے جاتے ہیں تو اطاعت خواہ کسی طاغوت کی ہو رہی ہو اس سے خدا کی عبادت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا انھیں اس آیت پر غور کرنا چاہیے۔ اگر غیر اللہ کی اطاعت سے اللہ کی عبادت میں کوئی فرق نہیں آتا تو آخر ان منافقین کا کیا جرم تھا کہ ان کو مشرک اور غیر اللہ کی بندگی کرنے والا قرار دیا گیا ہے؟

یہ مسئلہ چوں کہ نہایت اہم ہے اور قرآن سے غفلت کی وجہ سے لوگ اس بارے میں ایسی غلط فہمیوں میں پڑ گئے ہیں، جو سرے سے دین کی بنیاد ہی ڈھائے دے رہی ہیں اس لیے مزید توضیح کے لیے ایک آیت ہم اور پیش کرتے ہیں۔ سورۂ نساء میں فرمایا ہے:

وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ (النساء: ۱۱۵، ۱۱۶)

"اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے بعد اس کے کہ اس پر اللہ کی ہدایت واضح ہو چکی ہے اور پیروی کرے مسلمانوں کی راہ کے سوا دوسری راہ کی ہم اس کو پھیر دیں گے اسی چیز کی طرف جدھر وہ متوجہ ہوا اور داخل کریں گے جہنم میں وہ برا ٹھکانا ہے۔ بے شک اللہ نہیں معاف کرتا اس بات کو کہ اس کا ساجھی ٹھیرایا جائے اور جو کچھ اس کے سوا ہے اس کو جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک بنائے گا وہ بہت دور بھٹک گیا۔"

اس آیت سے یہ بات صاف ہوتی ہے کہ رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کی مخالفت کرنا اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنا شرک ہے اور اس کی سزا جہنم ہے اور جہنم برا ٹھکانا ہے۔ ایک امر پر اس پہلو سے تو گفتگو ہو سکتی ہے کہ یہ اللہ ورسول سے ثابت ہے یا نہیں۔ لیکن اگر اس کا اللہ ورسول کی بات ہونا متعین ہے تو اس پر سر گوشی کرنا، اس کو خلاف حکمت قرار دینا، اس کو روح زمانہ کے خلاف کہنا اور اس کو چھوڑ کر اپنے جی سے یا دوسروں کی تقلید میں کوئی اور راہ اختیار کر لینا شرک ہے اور اللہ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ (الآیۃ) والی آیت ایک ہی سورہ میں دو جگہ وارد ہے۔ ایک جگہ اہلِ کتاب کے شرک کے بیان میں ہے، جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور یہ دوسری جگہ منافقین کے شرک کے بیان کے سلسلے میں ہے اور ایک صاحب نظر اگر ان دونوں مقامات پر غور کرے تو اسے نہایت آسانی سے قدر مشترک مل جائے گا۔ اہلِ کتاب کے سلسلے میں جہاں یہ آیت وارد ہے، وہاں ان کے تین شرک بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی ہدایت پر اپنی قوم کی ہدایت کو ترجیح دیتے ہیں، دوسرا یہ کہ وہ اللہ کی کتاب پر جبت وطاغوت کی پیروی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور تیسرا یہ کہ اہلِ ایمان کے طریقہ پر اہلِ مکہ کے طریقہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور یہاں اس آیت سے اوپر والی آیت میں یہ تمہید ہے کہ لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ یعنی یہ منافقین پیغمبر کی ذات کا آپ کے احکام اور آپ کی تعلیمات کے خلاف جو سرگوشیاں کرتے ہیں ان میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ خیر صرف اس سرگوشی میں ہے جو ترغیب صدقہ، امر بالمعروف اور لوگوں کی اصلاح کی راہ میں ہو۔ باقی جو لوگ خدا اور اس کے رسول کے حکم پر اپنی رائے کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ اپنی خدائی کے مدعی ہیں اور اگر کسی دوسرے کی رائے اور مذہب کو ترجیح دیتے ہیں تو اس کو الٰہ قرار دیتے ہیں اور ان دونوں ہی صورتوں میں وہ مشرک ہیں، موحد نہیں ہو سکتے۔

(۴)

پچھلی فصلوں کا خلاصہ

اس تمام درازنفسی اور طول بیان سے مقصود محض یہ دکھانا تھا کہ لا الٰہ کی نفی اور الا اللہ کا اثبات زبان سے ادا کرنے کے لیے تو نہایت سہل اور مختصر ہے۔ لیکن ان کے مقتضیات اور لوازم کا مظاہرہ جب عملی زندگی میں ہوتا ہے تو انسان کی زندگی کا کوئی گوشہ ان کے دائرہ سے باہر نہیں رہ جاتا۔

یہ حقیقت پچھلی تین فصلوں میں ایک موزوں تدریج کے ساتھ واضح ہو گئی ہے۔ اہلِ مکہ خدا کی ہستی اور اس کے تمام بنیادی صفات کے معترف تھے۔ لیکن قرآن نے ان کے اس اعتراف پر کوئی وقعت نہیں دی۔ اہلِ کتاب نے ان سے بہت آگے بڑھ کر نہ صرف توحید کا بلکہ اس کی کتابوں کا، اس کے ملائکہ کا اور اس کے رسولوں کا بھی اقرار کیا لیکن قرآن کی میزان میں ان کا اقرار بھی بالکل بے وزن ٹھیرا۔ سب سے آخر میں منافقین آئے اور انھوں نے خیال کیا کہ توحید کے مقتضیات ولوازم میں سے کوئی بات ایسی نہیں رہ گئی ہے جو انھوں نے پوری نہ کر دی ہو اور شرک کی آلائشوں کا کوئی دھبہ ایسا نہیں رہ گیا ہے، جس کو انھوں نے دھو نہ ڈالا ہو۔ لیکن قرآن نے ان کے اندر سے بھی شرک کا کھوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا اور ہر گروہ کو مطلع کر دیا کہ تم میں سے کوئی بھی خدا کا مخلص اور موحد نہیں ہے ہر ایک نے اپنی بندگی میں دوسروں کو ساجھی بنا رکھا ہے۔ اور اللہ کی نظر میں اس بندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے، جس میں شرک کی ملاوٹ ہو۔

اب تینوں گروہوں کی فردِ قراردادِ جرم ملاحظہ ہو۔

بنی اسماعیل سے کہا گیا:

تم فرشتوں کو مرتبہ بندگی سے مافوق سمجھتے ہو۔ ان کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہو۔ ان کی

پوجا کرتے ہو۔ اس پوجا کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہو۔ مال و اولاد اور دنیا کی خوش حالی و فارغ البالی کو ان کی برکت کا ثمرہ قرار دیتے ہو۔ خدا کے یہاں ان کی شفاعت موجب نجات خیال کرتے ہو۔ ان سے خدا کی طرح محبت کرتے ہو، ان کو عالم الغیب مانتے ہو۔

اسی طرح جنات کو خدا کا کفو سمجھتے ہو۔ ان کو خدائی مفہوم میں نافع و ضارّ خیال کرتے ہو۔ اُن کی دہائی دیتے ہو۔ ان کی رضا طلبی کے لیے اپنی اولاد کو قتل کرتے ہو۔ ان کی رسائی ملاء اعلیٰ تک مانتے ہو۔ ان کو علم غیب کا وسیلہ جانتے ہو۔ ان کی بندگی کرتے ہو۔ ان سے الہام حاصل کرنے کے لیے مراقبہ کرتے ہو۔ کواکب کو تدبیر عالم میں مؤثر بالذات مانتے ہو۔ بارش کو نکھتروں کا فیض سمجھتے ہو۔ اپنی تمام کاروباری چہل پہل کو شعریٰ کی برکت سمجھتے ہو۔

تم نے اپنے ان معبودوں کی ایک بزم بنائی ہے۔ اس میں خدا کی حیثیت بس ایک مہادیو کی ہے، جس کا تعلق محض اس کے دار السلطنت آسمان سے ہے۔ زمین میں اس کی مملکت کا ایک دور دراز علاقہ ہے، جس کا انتظام وہ اپنے عمال کو سپرد کر کے خود اس سے کنارہ کش ہے۔ تم ان معبودوں کی عبادت کرتے ہو، تم نے ان کے لیے معبد اور استھان بنائے ہیں، تم ان کے حج و زیارت کے لیے سفر کرتے ہو۔ ان کے لیے قربانیاں کرتے ہو۔ نذریں اور چڑھاوے پیش کرتے ہو، ان کے نام پر جانور چھوڑتے ہو، ان کے تعلق سے بہت سی چیزیں حرام و حلال کرتے ہو، ان کے حضور میں حاضر ہو کر، فال کے تیروں سے ان کی مرضی معلوم کرتے ہو۔ ان کی قسمیں کھاتے ہو۔

تم نے اپنے بزرگوں کی قبروں اور ان کے آثار کو معبد بنالیا ہے۔ تم ان کو وسیلۂ شفاعت اور ان کی عبادت کو ذریعۂ تقربِ الٰہی سمجھتے ہو۔ ان کی رسموں کو دین و شرع قرار دیتے ہو۔

پھر تم خود بھی الٰہ بن بیٹھے ہو۔ تم اللہ کی ہدایت کی جگہ اپنے نفس کی خواہش یا دوسروں کے قانون کی پیروی کرتے ہو، تم نے باپ دادا کے طریقوں اور رسوم و رواج کو شریعت بنا رکھا ہے اور اس طرح سوسائٹی اور خاندان اور قبیلہ کو الٰہ بنائے بیٹھے ہو، اپنے جی سے قانون و شریعت بناتے ہو۔ تمھارے باپ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے جو دین تمھیں دیا تھا اس میں تم نے اپنی بدعتیں ملا دی ہیں۔ تم خود اپنے شارع بن گئے ہو۔ تم اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنے استحقاقِ ذاتی کا ثمرہ اور اپنے علم و ہنر کا نتیجہ سمجھتے ہو۔ تم کو اپنی برتری کا گھمنڈ ہے۔ تم کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کا غرہ ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تمھارا ہر کام بلا استناد شریعت

اللہ کا کام ہے، یہ ساری باتیں شرک ہیں۔خدا پرستی کے دعوے کے ساتھ ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

اہلِ کتاب سے قرآن نے کہا:

تمھاری دعویٰ توحید و خدا پرستی بھی باطل ہے۔تم اپنے علماء اور راہبوں کو قانون سازی اور تحریم و تحلیل کا اختیار دیتے ہو، یہ جو کچھ فرمادیں تمھارے نزدیک وہ قادرِ مطلق کے احکام ہیں۔ یہ زمین پر جو باندھیں وہ آسمان پر باندھا جاتا ہے اور زمین پر جو کھولیں وہ آسمان پر کھولا جاتا ہے۔ تم نے کتاب اور طریقہ نبی سے اجتہاد کی جگہ کاہنوں کے اقوال کو دے رکھی ہے۔یہود عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔نصاریٰ مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ان کو خدا کا اوتار قرار دیتے ہیں۔الوہیت کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور خدا کو اس تین کا تیسرا قرار دیتے ہیں۔

پھر تم اپنی برتری کے مدعی ہو۔تمھیں ابراہیم کی اولاد ہونے کا گھمنڈ ہے۔تم اس نسبت کو خدا کے تقرب اور اس کے محبوب ہونے کے لیے کافی سمجھتے ہو۔اور خدا کی اطاعت سے نکل کر طاغوت بن بیٹھے ہو۔تم نے کتابِ الٰہی کے حامل ہونے کے باوجود جابرہ کی بندگی اختیار کی اور طاغوتی نظام یا تو خود قائم کیے یا ظالموں کے قائم کردہ طاغوتی نظاموں کو قبول کیا۔تم اپنے تئیں پاک اور برگزیدہ سمجھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ جو کچھ تم سے صادر ہو جائے وہ سب پاک و پاکیزہ اور اللہ اور دین کا کام ہو جاتا ہے، اس کا خدا کے حکموں کے مطابق ہونا ضروری نہیں۔تم نے خدا کے نبیوں میں تقسیم کر رکھی ہے ایک گروہ کو مانتے ہو، دوسری جماعت کا انکار کرتے ہو۔اللہ کی ہدایت کی جگہ اپنی ہدایت اپنے طریقے، اپنے انبیاء اور اپنی قوم کو مرکز ہدایت قرار دیتے ہو۔مدعی ہو کہ تمھارے لیے ہمیشگی کا عذاب نہیں ہے۔کچھ بھی کرو، تھوڑی سی سزا بھگت کر تقرب الٰہی کے مقام پر عالی سرفراز ہو جاؤ گے۔تم سحر، شعبدہ، رمل، جفر اور علوم سفلیہ پر ایمان رکھتے ہو۔تم ان لیڈروں اور کاہنوں پر ایمان رکھتے ہو جن کی باتیں اللہ کی ہدایت سے الگ ہیں اور جو شیطان کے پیرو اور خود طاغوت ہیں۔تم شرک کے حامی ہو اور مشرکوں کے طریقہ کو اہلِ ایمان کے طریقہ پر ترجیح دیتے ہو۔یہ ساری باتیں توحید اور اخلاص کے منافی ہیں۔

منافقین سے قرآن نے کہا:

تمھارا دعویٰ توحید بھی باطل ہے۔تم تحاکم الی الطاغوت کے مجرم ہو۔تم اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہو۔جو اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت سے منحرف ہیں۔تم رسول

کویا تو اعتقاداً واجب الاطاعت نہیں مانتے یا عملاً یا دونوں طرح حالاں کہ اطاعت بغیر رسول کی اطاعت کے ممکن نہیں اور خدا کی عبادت کا دعویٰ بغیر اس کی اطاعت کے جھوٹا ہے۔ توحید کی لازمی شرط یہ ہے کہ اپنے تئیں بالکلیہ رسول کے حوالہ کرو۔ اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔ اپنے سارے معاملات میں اُسی کی طرف رجوع کرو اور اس کے فیصلوں کو بے چوں وچرا مانو۔ تم اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم پر نکتہ چینی کرتے ہو یا اپنے دلوں میں اس پر اعتراضات چھپائے ہوئے ہو اور اس کے متعلق شکوک وشبہات اور تذبذب وتردد رکھتے ہو۔ اللہ اور رسول نے اہلِ ایمان کے لیے جو طریقہ ٹھیرا دیا ہے، اس سے انحراف کرتے ہو۔ رسول کی پیروی صرف اپنے فوائدِ دنیوی کی حد تک کرنا چاہتے ہو۔ تم اپنے دنیوی مفاد اور اپنی شخصی دلچسپیوں اور اپنے خون کے رشتوں اور حلیفانہ روابط کو اللہ اور رسول اور اس کے دین سے عزیز تر رکھتے ہو۔ یہ ساری باتیں شرک ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ شرک کو کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔

☆☆

(۵)

موجودہ دنیا کا سرسری جائزہ

اب ہمارے پاس وہ روشنی موجود ہے، جس کو لے کر دنیا کے جائزہ کے لیے نکل سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ قوموں بالخصوص 'متمدن' قوموں کا شرک و بت پرستی کے اعتبار سے کیا حال ہے۔ لیکن اس رسالہ کی ہر فصل میں غایت درجہ اختصار ملحوظ ہے اس لیے ہم اولاً تو صرف سرسری اشارات پر کفایت کریں گے۔ ثانیاً ہر مذہب کے پیرووں کی صرف موجودہ حالت کو سامنے رکھیں گے، ان سے مذاہب کی اصل حقیقت سے بحث نہیں کریں گے۔ ثالثاً صرف ان قوموں سے تعرض کریں گے جو تمدنی اعتبار سے کچھ اہمیت رکھتی ہیں، ورنہ یہ حکایت اتنی دراز ہوجائے گی کہ اس کو سمیٹنا مشکل ہوجائے گا۔

بحث کی آسانی کے لیے ہم پہلے مشرق اقصیٰ کی اقوام اور بدھ مذہب کے پیرووں کا جائزہ لیں گے۔ پھر ہندستان کو دیکھیں گے اس کے بعد ایک طرف مغربی یورپ اور امریکہ کا اور دوسری طرف روس کا جائزہ لیں گے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ تہذیب جدید کے ان برقعوں کے اندر شرک کی کیسی گھناؤنی اور مکروہ شکلیں چھپی ہوئی ہیں اور علم و تحقیق کے مدعیوں کے اس دعوے کے باوجود کہ اب شرک دنیا سے ناپید ہو چکا ہے۔ وہ کیسی حیرت انگیز وسعت کے ساتھ پورے کرۂ ارضی پر چھایا ہوا ہے۔

مشرقِ اقصیٰ

مشرقِ اقصیٰ کی اقوام کا غالب حصہ عموماً چار مذہبوں کا پیرو ہے۔ شنٹو مذہب، تاوی مذہب (Tsoisn)، کنفیوشیزم اور بدھ مذہب۔

جاپان کا اصلی مذہب شنٹو مذہب ہے۔ ویسے تو جاپان کی سرزمین پانچ سو مذاہب کی سرزمین کہی جاتی ہے لیکن اس کا قدیم ترین اور جدید ترین مذہب شنٹو مذہب ہے۔ چھٹی صدی کے اواخر میں کوریا کے راستے سے بدھ مذہب بھی وہاں داخل ہو گیا تھا اور نویں صدی میں اس نے شنٹو مذہب کو بالکل ہی نگل لیا تھا لیکن سترھویں صدی میں جاپان میں قومیت کی جو زبردست تحریک اٹھی، اس نے ملک کے اس قدیم مذہب کو پھر سے زندہ کر دیا اور اس کے بعد سے اب یہی جاپان کا سرکاری اور قومی مذہب ہے۔

اس مذہب کا خاص اصول نیچر اور بزرگوں کی پرستش ہے۔ اس میں کوئی اسی لاکھ دیوی دیوتا ہیں لیکن خاص الخاص سورج کی دیوی ہے، جس کا پوتا جاپانیوں کے خیال کے مطابق جاپان کا پہلا حکمراں ہوا اسی سے جاپان کا تخت حکومت یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا ہوا موجودہ میکاڈو کو ملا ہے۔ اسی سورج کی دیوی کی نسل ہزار برس سے جاپان پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اگرچہ اس مذہب میں سمندر کی دیوی، ندیوں کی دیوی، پہاڑوں کی دیوی، آگ کی دیوی، غرض بے شمار دیویاں تسلیم کی جاتی ہیں اور قوم کے جاں باز سپاہیوں اور شاہی خاندان کے وفادار خادموں کی بھی پرستش ہوتی ہے۔ لیکن شنٹو مذہب کا اصل الاصول شاہی خاندان کے سب سے پہلی بزرگ دیوی اور اس کے رشتہ داروں اور اس کی اولاد کی پوجا کرنا ہے۔

چین کا بڑا حصہ تاوی مذہب، کنفیوشیزم اور بدھ مذہب کا پیرو ہے۔ قدیم زمانوں سے آباء واجداد بھوتوں اور شیطانوں، دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش ان مذاہب کی اصلی خصوصیت رہی ہے، مقدم الذکر دونوں مذہب آباء پرستی اور نیچر پرستی کو اصولاً تسلیم کرتے ہیں۔ بدھ مذہب اگرچہ اصلاً آبا پرستی کا حامی نہیں ہے۔ لیکن چین میں پہنچ کر وہاں کے قدیم مذہب نے اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اور اب یہ تینوں مذاہب چین میں آبا پرستی، مظاہر پرستی اور شیاطین پرستی کے مذہب ہیں۔ جادو، منتر، سحر، شعبدے ان کی مشترک خصوصیتیں ہیں اور ان کے پیروؤں کے اوہام و خرافات کی داستان اتنی طولانی ہے کہ پڑھنے والا تھک جاتا ہے۔

تاوی مذہب کا بانی لاؤتزے ہے، اس کا اصلی فلسفہ نفی کا فلسفہ ہے۔ اس کا مذہبی صحیفہ مشکل سے مرقس کی انجیل کے نصب کے برابر ہوگا۔ لیکن اس مذہب کے پیروؤں نے بعد میں اس پر جن اوہام کا اضافہ کیا ہے ان کی تفصیلات ضخیم مجلدات میں بھی نہیں سما سکتیں۔ تاوی فقراء سو برس

قبل مسیح سے مشرقی سمندر میں پریوں کے ایک ایسے جزیرہ کے سراغ میں سرگرداں ہیں، جہاں شجرۃ الخلد اگتا ہے۔ انھوں نے سارے آسمان کو دیویوں اور دیوتاؤں سے اور ساری زمین کو جادوگروں اور شعبدہ بازوں سے بھر دیا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اگر اپنے احساسات کی نفی اور جاودانی زندگی کا راز پائے تو آسمانی دیوتاؤں کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کی آسمانی دیویوں میں ''آسمان کی ملکہ''، ''مقدس ماں'' کو سب سے زیادہ عظمت و اہمیت حاصل ہے۔ یہی سمندروں کی دیوی اور موجوں اور طوفانوں کی ملکہ ہے۔ ہر چینی ملاح، ہر ماہی گیر، ہر جہازراں اور ہر بحری سیاح کی یہ محافظ ہے۔ جب سمندر میں کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو اس کی دہائی دی جاتی ہے اور وہ فوراً آسمانوں میں نمودار ہو کر بڑے بڑے طوفانوں کو اپنی تلوار سے دفع کر دیتی ہے۔ سمندر کی تاریکیوں میں گم کردہ جہازرانوں کی رہنمائی کے لیے یہ سرخ لالٹین لے کر نمودار ہوا کرتی ہے۔

کنفیوشزم کا بانی کنفیوشس ہے۔ چین کا اصلی مذہب آباء پرستی ہے اور کنفیوشزم کی حقیقت اس سے کچھ زیادہ نہیں ہے کہ وہ آباء پرستی کے لیے ایک سندِ تصدیق ہے۔ آباء پرستی چینی میتھالوجی کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ان کے ہاں سب سے زیادہ عظمت و اہمیت مردوں کی ارواح کو حاصل ہے۔ چین کی اصلی خدائی ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یوں تو چینی اپنے سارے ہی دیوتاؤں کو قربانیاں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ صدقِ دل کے ساتھ وہ اپنے باپ دادا کی عبادت کرتے ہیں۔

چینی عقیدہ کے مطابق مردوں کی روحیں زمین پر باقی رہتی ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ان کو کھلایا پلایا نہ جائے۔ ان کو راضی نہ رکھا جائے اور ان کی عبادت نہ کی جائے تو وہ خفا ہو جاتی ہیں اور ان کی خفگی بہت سی آفتیں لاتی ہے۔ ان کے عقیدہ کے لحاظ سے جس شخص کی روح کی اس کی اولاد کی طرف سے تعظیم اور پرستش نہیں کی جاتی وہ روح ایک ابدی شقاوت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

چین میں فرد کی انفرادی ہستی کا تصور معدوم ہے۔ ہر فرد اپنے آباواجداد کے اس طویل سلسلے کے ساتھ مربوط سمجھا جاتا ہے، جو ابتدائے آفرینش سے لے کر خود اس کے وجود تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر زندہ چینی کی ہستی یکسر مردوں کی ارواح کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ اگر مردوں کی تعظیم، تمام مراسم مقررہ کے مطابق بجالانے میں معمولی کوتاہی بھی ہو جائے تو بس قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

ہزار ہا برس گزر چکے ہیں، چینیوں کے آباء واجداد دورِ حجری کی بدویانہ زندگی سے نکل کر دورِ جدید کی حضری زندگی میں داخل ہو چکے ہیں۔ پچیس شاہی خاندان ملک پر حکومت کر چکے ہیں۔ خوف ناک جنگوں اور عظیم الشان انقلابات نے ملک کے آسمان وزمین بدل دیے ہیں۔ لیکن چین کی آباء پرستی روزِ اول سے آج تک بدستور قائم ہے اس میں سرِ مو تغیر نہیں ہوا۔

کنفیوشس نے بہت سے عمدہ اخلاقی اصولوں کی بھی تعلیم دی ہے لیکن اس کی تمام تعلیمات کی بنیاد آباء پرستی پر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''ہمیں اپنے آباء واجداد کے لیے ان کو حاضر و ناظر سمجھ کر قربانیاں پیش کرنی چاہئیں۔'' اور ''ہمیں ارواح کی اس طرح عبادت کرنا چاہیے گویا وہ ہمارے اندر موجود ہیں۔''

اگرچہ اس نے کہیں اپنی تعلیمات میں اپنے خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے لیکن ملک کے ہمہ گیر مذہب اور اپنی مذکورہ تعلیمات کی بدولت مرنے کے بعد وہ خود بھی لاوتزے کی طرح دیوتا بن گیا اور آج چین میں ایک بڑے دیوتا کی حیثیت سے اس کی بھی عبادت ہوتی ہے۔

بودھ مذہب کی جائے پیدائش ہندستان کی سرزمین ہے، لیکن برہمنوں نے اس کو اس ملک سے اس طرح نکالا کہ پھر اس نے ادھر کا رُخ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ یہاں سے جلاوطن ہونے کے بعد اس کو ہندستان کے مشرقی جزائر برما، چین، جاپان اور تبت وغیرہ میں پناہ ملی اور اب جاپان کے سوا، جہاں سترھویں صدی کی تحریک قومیت سے اس نے شکست کھائی تقریباً ہر جگہ نمایاں حیثیت میں موجود ہے اور چین وتبت وغیرہ میں اس کے پیروؤں کی ایک عظیم تعداد پائی جاتی ہے۔

گوتم بدھ کے متعلق عام خیال ہے کہ وہ خدا کا قائل نہیں تھا، لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ دنیا کی قدیم تاریخ ہمیں مشرکوں سے تو بھری نظر آتی ہے لیکن خدا کے منکروں کا کہیں بھی کوئی نشان نہیں ملتا۔ خدا کے انکار کرنے والے اگر کچھ بلید ملتے ہیں تو صرف موجودہ دور میں ملتے ہیں۔ پھر گوتم بدھ جیسے فلسفی کے متعلق کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ خدا کا منکر ہوگا؟ ہم نے گوتم بدھ کے عہد کی تاریخ اور اس کے مذہب کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ وحدۃ الوجود کا قائل تھا۔ گوتم بدھ سے پہلے ہندستان میں اپنشدوں کے ذریعے سے وحدۃ الوجود کا فلسفہ اچھی طرح پھیل چکا تھا۔

وحدۃ الوجود کے قائل کے لیے خدا کے اقرار و انکار کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے نزدیک تو 'انا' کے سوا تمام کائنات وہم و فریب ہے۔ یوگی کا کام یہ ہے کہ وہ زندگی اور موت کے چکر اور مایا کے جال سے چھوٹ کر روح کائنات یا بالفاظِ دیگر ''انا'' میں ضم ہو جائے۔ گوتم بدھ کے دور سے پہلے ہندو یوگیوں کی ریاضتوں کی جو تاریخ ہمیں ملتی ہے، وہ تمام تر درحقیقت اسی عقیدہ کا مظاہرہ ہے۔ وہ طرح طرح کی خوف ناک ریاضتوں کے ذریعے سے مایا کے جال سے نکلنے اور روح کائنات میں ضم ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ جب گوتم بدھ کی آنکھیں کھلیں اور نجات کے لیے اس کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی تو اس کے سامنے بھی یہی فلسفہ آیا اور اس نے بھی برہمنوں کے ہی طریقہ پر زندگی اور موت کی کشاکش اور خواہشوں کے جنجال سے نکلنے کے لیے نہایت جاں گسل ریاضتیں شروع کیں۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے تجربہ کے بعد اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ مادیت کے خلاف سے نکلنے کے لیے یہ ہولناک ریاضتیں غیر ضروری ہیں۔ اصلی شے نفس کا خواہشوں سے پاک ہونا اور روح و دل کا محسوسات کی محبت سے آزاد ہونا ہے۔ چناں چہ جہاں تک تکلیف دہ ریاضتوں کا تعلق ہے اس نے برہمنوں کے طریقہ کی اصلاح کر دی اور تزکیۂ نفس اور تجرد کے حصول کے لیے ایسے ضابطے بنائے، جن میں ظاہری ترک سے باطنی ترک پر زور دیا گیا تھا۔

وحدۃ الوجود کی آخری تان انا اللہ اور انا الحق ہے۔ چناں چہ اسی چیز نے ہر ہندو یوگی کو عبد کے بجائے طاغوت بنا دیا گویا تم بدھ کی جدوجہد بھی اسی مقصد کے لیے تھی۔ چناں چہ وہ بھی اپنے خیال کے مطابق مادّیت کا جامہ اتار کر روح کائنات میں ضم ہو گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے معتقدین نے اس کو خدا بنا دیا اور اس کی ولادت کے متعلق بہت سے بے سروپا افسانے پھیلا کر اسے ایک ایسے اوتار کی حیثیت سے پیش کیا جو دنیا کو نئی زندگی بخشنے آیا تھا۔ اب چین، جاپان، تبت، برما وغیرہ میں اس کی پرستش خدا کی حیثیت سے ہوتی ہے اور اس کے شان دار مندر اور عظیم الشان بت دیکھنے والوں پر حیرت طاری کر دیتے ہیں۔ چین میں اس کے پرستار ہر قسم کے بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستشوں میں مبتلا ہیں۔ تبت وغیرہ میں اور بھی برا حال ہے۔ تبت کا سب سے بڑا پیشوائے مذہبی (دلائی لاما) خود گوتم بدھ کا اوتار خیال کیا جاتا ہے اور اسی طرح خدائی کرتا ہے، جس طرح گوتم بدھ۔ وہاں کا دلائی لامہ جب مرتا ہے تو ہر حاملہ عورت ایک نیا خدا جننے کی

آرزو سے معمور ہو جاتی ہے اور اس دور میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں، قرعہ اندازی کے ایک خاص طریقہ سے ان میں سے ایک نئے الٰہ کا انتخاب ہوتا ہے۔

ہندستان

ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ یہاں کا ہر ذرّہ دیوتا ہے۔ چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک اور ذرّہ سے لے کر آفتاب تک سب یہاں معبود اور مقدس ہیں۔ دریا، پہاڑ، شجر، حجر، پرندو چرند، بلّی، چوہے۔ یہاں تک کہ بعض نا قابلِ ذکر انسانی اعضا تک کے پرستار یہاں مل جائیں گے۔

ویدوں میں ہمارے سامنے سب سے پہلے ''ہزار چشم'' اندر آتا ہے، جس نے اپنے عملی نمونے سے اپنے پرستاروں کو ''بدمستی'' اور نشہ بازی کی تعلیم دی۔ اس کے بعد برمہا، وشنو، اور شیو کی تثلیث نظر آتی ہے۔ مقدم الذکر خالق ہے، ثانی الذکر محافظ ہے۔ اور تیسرا مارنے والا اور جلانے والا ہے۔

برمہا اپنے ہر کلپ کے بعد دنیا کو فنا کر کے از سرِ نو وجود بخشتا ہے۔ اس کا مندر آج تک راجپوتانہ میں مرجع خلائق ہے۔

وشنو، جب دنیا پر کوئی بڑی آفت آتی ہے تو خلق کی نجات کے لیے اترتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ بار بار اوتاروں کی صورت میں جنم لیتا ہے۔ اس کے دس اوتار ہندو میتھالوجی میں مشہور ہیں۔ سری کرشن بھی وشنو کے اوتار خیال کیے جاتے ہیں اور ان کی زندگی کو جس رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ اور اس سے جو مذہبی روایات ہندو قوم میں پھیلی ہیں ان کے بیان سے بھی شرم آتی ہے۔

شیو، وشنو کا حریف مقابل ہے۔ یہ ایک ہی ساتھ دو متضاد فطرتیں رکھتا ہے۔ اس کے قبضۂ قدرت میں تعمیر و تخریب دونوں ہیں۔ اس کے اندر عورت و مرد دونوں کی خصوصیات جمع ہیں۔

اس کے بعد ہمارے سامنے پتنجلی کا فلسفہ یا ہندو تصوف آتا ہے۔ اس کی بنیاد وحدۃ الوجود پر ہے۔ اس فلسفہ میں موجود صرف ''انا'' ہے اس کے ماسوا سب وہم و فریب ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ ذرہ آفتاب، قطرہ دریا اور بندہ خدا بن جائے۔ اس کا راستہ یہ ہے کہ ریاضات شاقہ کے ذریعے سے روح کو مادہ سے مجرد کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ہندو یوگیوں اور فقیروں نے جو

طریقے پیدا کیے ہیں، ان کی تفصیلات سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور اس کے لیے عملاً انھوں نے جو کچھ کر دکھایا ہے اس کے تصور سے بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن جو انسان اپنے معمولی مقاصد کے لیے جان کی بازی کھیل جایا کرتا ہے وہ خدا بننے کے لیے جو کچھ بھی کر جائے کم ہے۔ چناں چہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان ہندو یوگیوں نے جس طرح کی ریاضتیں کی ہیں اس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں مشکل سے مل سکیں گی لیکن یہ سب کچھ خدا کی بندگی کے لیے نہیں کیا گیا۔ خدا بننے کے لیے کیا گیا۔

دیوتاؤں کے بعد ہندو میتھالوجی میں دیویوں کی باری آتی ہے اور ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ان سب کی خصوصیات کی تفصیل میں پڑنا تو لاحاصل ہوگا، البتہ لکشمی، درگا، بھیروی اور کالی مائی کے نام ہم یاد دلائے دیتے ہیں۔ بالخصوص ان میں سے مؤخر الذکر کو ہندوؤں کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہیضہ وغیرہ جیسی خطرناک بیماریاں سب ان ہی کی غضب ناکیوں کے مظاہر ہیں۔

ہندوؤں کے اندر جس قدر بھی فرقے ہیں وہ یا تو ان دیویوں اور دیوتاؤں کے پرستار ہیں یا گیتا اور پتنجلی کے فلسفہ سے متاثر ہیں۔ بعض فرقے جو کسی قدر مختلف نظر آتے ہیں، ان کا اختلاف محض ظاہری ہے، حقیقت اور مغز کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف دو فرقے کسی قدر مستثنیٰ حالت رکھتے ہیں ایک آریہ سماجی دوسرے سکھ، یہ دونوں اسلام سے متاثر ہوئے ہیں اور توحید کے مفہوم سے کسی قدر قریب آئے ہیں لیکن اسلام سے ان کی قربت ایک دفاعی جذبہ کے ماتحت وجود میں آئی ہے اس وجہ سے اس قربت کے باوجود اسلام سے دور ہی ہیں۔ ان فرقوں کے بانیوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ مسلمانوں کا مقابلہ بت پرستی پر قائم رہ کر مشکل ہے، اس لیے انھوں نے مورتیوں وغیرہ کی پوجا ترک کر کے فی الجملہ ایک ایسی اصلاح قبول کر لی، جس کے بعد وہ اپنے خیال کے مطابق روح زمانہ اور عقل سے قریب آگئے اور اپنے تئیں اس قابل خیال کرنے لگے کہ اب وہ مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کو مسلمانوں سے جو عداوت ابتدا سے ہے وہ کسی اور فرقہ کو نہیں ہے حالاں کہ ان کو مسلمانوں کے اصل الاصول سے قریب ہونے کی وجہ سے ان سے محبت کرنی تھی۔ بہر حال یہ اصلاح انھوں نے کسی جذبہ کے ماتحت قبول کی ہو ایک اہم اصلاح ہے اور اس کی وجہ سے وہ اسلام کی بنیادی تعلیم

سے قریب آ گئے ہیں۔ اب ان کو توحید اور اس کے مقتضیات کی تعلیم دینا آسان کام ہے بشرطے کہ حق ان کے سامنے اس راستے سے آئے جو اس کا اصلی راستہ ہے۔

مذہب پرست ہندستان کا یہ حال ہے۔ عوام و خواص سب اسی طرح کے توہمات مشرکانہ میں گرفتار ہیں۔ یہاں کے اچھے دماغوں پر گیتا کے وحدۃ الوجود کا تسلط ہے، جو بجائے خود ایک عظیم فتنہ ہے۔ آریہ اور سکھوں کی آخری معراج یہ ہے کہ یہ مورتی پوجا کے منکر ہیں لیکن ہمارے اوپر کے مباحث پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ حقیقی توحید تک پہنچنے کے لیے ابھی ان کو بہت سے مراحل طے کرنا باقی ہیں۔

جس طرح ہندستان پر مسلمانوں کے غلبے کے اثر سے سکھ اور آریہ سماجی وجود میں آئے، اسی طرح انگریزوں کے غلبہ اور مغرب کے جدید افکار و نظریات کے اثر سے ایک نیا گروہ وجود میں آیا ہے جو فی الجملہ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس نے بہت حد تک قدیم ہندو میتھالوجی کے توہمات سے اپنے دماغ کو آزاد کر لیا ہے۔ لیکن یہ ایک دوسری میتھالوجی تیار کر رہا ہے، جس کا مواد اس نے مغرب سے لیا ہے۔ اس میں پرانے دیوتاؤں اور دیویوں کی جگہ نئے دیوی دیوتا ہیں۔ اس میں انسان خود اپنا الٰہ ہے اپنے لیے خود قانون بناتا ہے۔ خود اپنے اوپر فرماں روائی کرتا ہے اور خدا کی زمین پر اپنی بادشاہی کا ڈنکا بجاتا ہے۔ اس کا نام ڈیموکریسی (جمہوریت) ہے۔

مغربی یورپ اور امریکہ

مغربی یورپ اور امریکہ کا اصلی مذہب عیسائیت ہے۔ عیسائیت کے بگاڑ کی ابتدائی تاریخ ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ نیقیہ کی کونسل کے بعد سے تثلیث کا عقیدہ باضابطہ اسٹیٹ کا مذہب بنا اور یورپ اور کلیسا کی خدائی کا دور شروع ہوا۔ نیز یہ واضح کر چکے ہیں کہ مذکورہ کونسل کے بعد آریوس اور اس کی پارٹی، جو حضرت مسیحؑ کے سچے خلیفہ پیٹر (شمعون صفا) کے عقائد کی وارث اور صحیح نصرانیت کی حامل تھی، نہایت اقلیت بلکہ مظلومیت و مقہوریت کی حالت(۱) میں آ گئی اور پال کی باطنیت اور تحریفات کی بنیاد پر کلیسا کے رسوم و عقائد کی عمارت کھڑی ہوئی۔

اب ہمیں ایک سرسری نظر بیچ کی صدیوں سے لے کر اصلاح (Reformation) کے

---

(۱) اسی پارٹی کے باقیات صالحات تھے جو آں حضرت ﷺ کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لائے اور ان ہی لوگوں کی قرآن نے جگہ جگہ تعریف کی ہے۔ نہ کہ پال کے متبعین کی جو ہمیشہ توحید دشمنی کے سرخیل رہے ہیں۔

عہد تک کی تاریخ پر ڈالنی ہے۔

اس بیچ میں ہمیں دو باتیں نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک کرسچن چرچ کی وحدت، دوسری اس کا ہمہ گیر اقتدار۔ قرونِ متوسط میں کلیسا کا اقتدار ایسا غالب اور ہمہ گیر ہو گیا تھا کہ تمام چھوٹی بڑی سلطنتیں اس کے ہاتھ میں بالکل ایک آلۂ بے جان بن کے رہ گئیں تھیں اور اس کے آگے مقدس رومی شہنشاہی کا جاہ و جلال بھی ماند پڑ گیا تھا۔ لیکن کلیسا نے اس اقتدار سے نہایت غلط فائدہ اٹھایا۔ اس اقتدار کے نشہ میں اس نے وہ جنگ صلیبی شروع کر دی، جس نے دو سو برس سے زیادہ تک پورے یورپ کو زیر و زبر رکھا۔ اس دوران میں خداوندان کلیسا نے جو جرائم کیے۔ جس طرح خلقِ خدا کا بے دریغ خون بہایا۔ جس طرح نوخیز بچوں تک کو جنگ کے نشہ سے سرشار کر کے تباہ کیا، جس طرح وقت کی تمام تعمیری قابلیتوں کو تخریب کی راہ پر ڈال دیا، اس کا ردِ عمل اہل یورپ کے دماغوں پر کلیسا کے خلاف ہوا۔ جنگ کی ناکامیابیوں اور تباہ کاریوں نے اہلِ فکر کے دماغوں میں ایک بحران سا پیدا کر دیا۔ ہر شخص کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اربابِ کلیسا کا اقتدار دنیا کی تباہی ہے۔ علم و تحقیق کے شیدائیوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ کلیسا تمام ذہن و فکر پر کابوس کی طرح مسلط ہو گیا ہے اور جب تک یہ کابوس دور نہ ہو گا، اس وقت تک فکر و نظر کی تمام راہیں مسدود رہیں گی۔ اربابِ سیاست یہ سوچنے لگے کہ حکومتوں پر کلیسا کا اقتدار بالکل خلاف عقل اور خلاف فطرت ہے، سیاست کو مذہب سے بالکل بے تعلق ہونا چاہیے۔ یورپ کی مختلف قومیں یہ محسوس کرنے لگیں کہ رومن کیتھولک چرچ دنیا پر رومی اقتدار کا ایک بہانہ ہے، اس کو ختم ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ خود کلیسا کے اندر ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی، جس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ہم مسیح کی زندگی سے ہٹ کر دنیا داری کی تمام شیطنیتوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ہمارا مقصد اب صرف دولت کے انبار اکٹھا کرنا اور اپنے عظمت و جلال کی نمائش کرنا اور دنیا کو تباہ کرنا رہ گیا ہے۔ ہمیں غربت کی زندگی، خدمت خلق، ترکِ دنیا اور اتباعِ مسیح کی طرف لوٹنا چاہیے۔

ان تمام چیزوں نے مل ملا کر یورپ میں وہ بحران کا دور پیدا کر دیا، جس کو ہم نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کے نام سے جانتے ہیں۔ بیکن وغیرہ جیسے اہلِ علم، مکیا ویلی، اور ہیوگو گروٹیس وغیرہ جیسے اربابِ سیاست گارڈینو برونو وغیرہ جیسے آزاد خیال مفکرین اسی بحرانی دور کی پیداوار ہیں۔ کلیسا نے ان لوگوں کی مخالفتوں کا جواب مذہبی جرائم کا فیصلہ کرنے والی عدالتوں

(Inquisitions) سے دیا اور مذہبی و سیاسی اصلاح کے داعیوں اور علم و تحقیق کے شیدائیوں کو ایسی خطرناک سزائیں دیں کہ ان کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ان سزاؤں نے کلیسا کی مخالفت اور پاپائیت کے ختم کرنے کے مطالبہ کو اور زیادہ قوی کر دیا۔ مختلف قوموں میں اپنی قومیت کے تحفظ کا جذبہ تیز سے تیز تر ہو گیا۔ اربابِ علم کا جوشِ تحقیق و اکتشاف قوی سے قوی تر ہو گیا اور فلسفہ نے تو گویا سر جوڑ کے کلیسائی توہمات کی بیخ کنی کا عزم کر لیا۔ خود کلیسائی حلقہ کے اندر اصلاح اور تبدیلی کا مطالبہ درجہ بدرجہ اتنا قوی ہو گیا کہ سولھویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے وائی کلف ہس اور لیوتھر جیسے زبردست حامیانِ اصلاح پیدا ہو گئے۔ اور انھوں نے متحد کرسچن چرچ کو پھاڑ کر دو حصوں میں بانٹ دیا اور باضابطہ پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد ڈال دی، جس کا بنیادی تخیل یہ تھا کہ مسیح اور خدا کے درمیان کسی واسطہ کی ضرورت نہیں ہے، انجیل کے سمجھنے اور مراسم مذہبی کے بجالانے کا حق ایک عام آدمی کو بھی اسی طرح حاصل ہے، جس طرح پاپائے روم کو۔

قومی حکومتوں کا آغاز تو تیرھویں صدی ہی میں ہو چکا تھا۔ سولھویں اور سترھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے نیشنلزم، متحدہ قومیت، مذہب اور سیاست کی علیحدگی اور مذہبی رواداری کا زور اس قدر بڑھا کہ کیسا کو خواہ کیتھولک ہو یا پروٹسٹنٹ اپنا تمام کاروبار سمیٹنا پڑا، علم و سیاست اور معاش و معیشت کے تمام گوشے چرچ کے تسلط سے یک قلم آزاد ہو گئے اور اس کی جگہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی وہ سیاسی تنظیمات وجود میں آگئیں جن میں مذہب صرف پرائیویٹ زندگی کا ایک مشغلہ رہ گیا اور اجتماعی زندگی پر احبار و رہبان کی خدائی کی جگہ عوام الناس اور پارلیمنٹوں کی خدائی شروع ہو گئی۔

اس تفصیل سے یہ امر واضح ہو گیا کہ عیسائیوں کو خالص خدا پرستی کی سعادت کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ پال نے ان کو مسیح، مریم، کاہنِ اعظم اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا کیا۔ اور رومن کیتھولک چرچ کی مشرکانہ خرافات کا دروازہ کھولا اور لیوتھر کی اصلاحات نے کلیسا کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے اس کی جگہ عوام الناس، پارلیمنٹوں کے ممبروں، بادشاہوں اور پریسیڈنٹوں کو بخش دی اور اس طرح پرائیویٹ اور پبلک زندگی کے الگ الگ ارباب بنا لیے گئے۔

۱۴ء کی جنگ عظیم نے جب جمہوریتوں کا ضعف واضح کیا تو یورپ کے بعض ممالک میں ڈکٹیٹر شپ کا آغاز ہوا، جمہوریت اور ڈکٹیٹر شپ میں فرق صرف ارباب کی تعداد کا ہے۔

جمہوریت میں بہت سے الٰہ مل کر قانون بناتے اور خدائی کرتے ہیں۔ ڈکٹیٹرشپ میں صرف ایک الٰہ اپنے شرکاء واعوان کی مدد سے خدائی کرتا ہے۔

روس

روس میں اشتراکیت کا دور دورہ ہے، اشتراکیت جمہوریت کا آخری قدم ہے۔ جمہوریت نے مذہب اور خدا کو پرائیویٹ زندگی کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا، اشتراکیت نے یہ رشتہ بھی کاٹ دیا۔ اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر انسان کی حاکمیت کو مسلط کر دیا۔ وہاں عیسائی تثلیث کی جگہ مارکس لینن اور اسٹالن کی تثلیث ہے۔ ان اقانیم ثلٰثہ میں جو نظام عقائد، جو نظام اخلاق اور جو نظام معاش و معیشت وضع کر دیا ہے۔ وہی روس کا دین ہے۔

(۶)

مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ

یہ تو ان گروہوں کے شرک کا حال تھا اور ہے جو شرک دشمنی کے مدعی بھی نہیں۔ اب ہمیں اس گروہ کی حالت دیکھنی ہے جو خالص توحید کی بنیاد پر بنا تھا اور جس کے قیام کی واحد غرض یہی تھی کہ دنیا سے شرک کو مٹا کر توحید قائم کرے۔

یہ امر بالکل قطعی ہے کہ محل کے بدل جانے سے کسی شئے کی حقیقت نہیں بدل جاتی۔ جو چیز مشرکین کے اندر شرک ہے، اہل کتاب کے اندر شرک ہے اور منافقین کے اندر شرک ہے وہی چیز اگر مسلمانوں کے اندر پائی جائے گی تو وہ توحید نہیں بن جائے گی۔ شرک ہی رہے گی۔ نجاست کسی ٹھیکرے میں ہو یا سونے چاندی کے کسی خوشنما ظرف کے اندر، دونوں جگہ نجاست ہے، اس تبدیلی سے اس کی حقیقت و ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ البتہ حالات کی تبدیلی سے اس کا حکم ضرور بدل جائے گا۔ خنزیر و خمر نجس ہیں اور ہر حال میں نجس ہیں لیکن ایک مضطر و مجبور اگر جان بچانے کے لیے بقدر سد رمق ان میں سے کچھ کھا لیتا ہے تو شریعت اس پر گرفت نہیں کرتی۔ پس ایک چیز ہے واقعہ اور ایک چیز ہے حالات کی تبدیلی کے اعتبار سے اس کا حکم۔ اس فصل میں ہم صورت واقعہ کا جائزہ لیں گے اور اس کے بعد والی فصل میں اس کا حکم بیان کریں گے۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت کا اگر جائزہ لیا جائے اور بے جا غرور اعتراف حق سے مانع نہ ہو تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عرب جاہلیت سے لے کر منافقین تک شرک کی جتنی قسمیں بیان ہوئی ہیں اگر وہ سب نہیں تو ان کا بڑا حصہ مسلمانوں کے اندر موجود ہے۔ صرف شکلیں بدلی ہوئی ہیں۔ عرب جاہلیت کی جنات پرستی، کواکب پرستی، آباء پرستی، خود پرستی۔ اہلِ کتاب کی علماء پرستی، جبت پرستی، طاغوت پرستی، قوم پرستی، اور حمایتِ شرک، منافقین کی طاغوت پرستی، انا

پرستی، اور مفاد پرستی۔ ان تمام "پرستیوں" میں سے کون سی پرستی ہے، جو آج مسلمانوں کے اندر موجود نہیں ہے؟

کتنے مسلمان ہیں جو علوم سفلیہ کی لعنتوں میں گرفتار ہیں۔ انھوں نے ٹونے ٹوٹکے، گنڈے تعویذ[1]، سحر اور طلسمات وغیرہ کو کسب معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ تسخیر جنات وشیاطین کے وظائف وعملیات کا علم ہی ان کے نزدیک اصلی علم ہے۔ جنات کی تسخیر کے لیے وہ طرح طرح کی ریاضتیں کرتے ہیں، چلہ کشی کرتے ہیں، نذریں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں، ان کو علم غیب کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ان کو مستقل بالذات نافع وضار خیال کرتے ہیں۔ ان کی دہائی دیتے ہیں۔ ان کے تعلق سے خدا کی کتنی جائز چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں اور کتنی ناجائز باتوں کو جائز کردیتے ہیں۔

اسی طرح کتنے ہیں جو علم اسماء اور خواص کلمات واشیاء کے چکر میں رہتے ہیں اور اس علم کو بعینہٖ اسی طرح کے برے مقاصد میں استعمال کرتے ہیں، جن میں ان کے پیش رو یہود استعمال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض ظالموں نے خود قرآن عزیز کو بھی حب وبغض، تسخیر وتفریق اور وضع واستقراحتی کہ امساک کے عملیات کا دفتر بنا رکھا ہے۔ اس قسم کی عملیات کے شائق خدا کی نعمتوں کو بعض اوقات عارضی طور پر اور بعض حالات میں مستقلاً حرام کرلیتے ہیں۔ اس طائفہ کے بعض اشخاص کے سامنے جب میں نے ذکر کیا کہ اذنِ الٰہی کے بغیر کسی شے کو حرام وحلال کرنا شرک ہے تو ان کو بڑا تعجب ہوا۔

وباؤں کے زمانے میں یا خاص خاص بیماریوں کے مریضوں کی موجودگی کی حالت

---

(۱) احادیث نبوی سے جن تعویذوں کے لیے زیادہ سے زیادہ رخصت نکلتی ہے اولاً تو وہ خاص خاص حالات کے لیے ہیں۔ ثانیاً ان کی اصلی روح اللہ واحد سے استعاذہ، اس کی طرف تفویض اور غیر اللہ سے اظہار برأت ہے۔ باقی رہے وہ تعویذ جن میں لایعنی کلمات ہوتے ہیں اور جن میں شرک کی اس آمیزش کا ظن یا علم ہے۔ ان کے جواز کا شرع شریف میں کوئی امکان بھی نہیں ہے لیکن یہ دیکھ کر نہایت قلق ہوتا ہے کہ تعویذ فروشی کی موجودہ دکانیں بیشتر ایسے ہی تعویذوں سے چل رہی ہیں جو عموماً مشرکانہ اور غیر مفہوم عجمی الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور اگر آیاتِ قرآن سے بھی استعاذہ کیا جاتا ہے تو عموماً تحریف کرکے۔ ایک بزرگ نے خود مجھ کو بچھو کا ایک عمل بتانا چاہا، جس میں سورۂ ناس کے ہر لفظ کا آخری حرف غائب کردیا گیا تھا۔ میں نے ان سے کہا حضرت قرآن کو مسخ اور بے معنی کرنے کی ذمے داری آپ ہی اٹھائیے مجھے اس سے معاف ہی رکھیے تو میری اس ناقدری سے وہ مجھ سے بہت مایوس ہوئے۔

میں، کتنی چیزیں ہیں جو گھروں کے اندر اس ڈر سے استعمال نہیں کی جاتیں کہ جو ارواح ان بیماریوں کا باعث ہیں ان کو ان چیزوں سے چڑ ہے اور ان کو دیکھ کر ان کا غضب اور بڑھتا ہے۔

نکھتروں، دنوں اور مہینوں اور کسوف وخسوف سے متعلق کتنے مشرکانہ توہمات ہیں، جن میں عورتوں سے گزر کر عاقل مردوں تک کو ہم نے گرفتار پایا ہے۔

کتنے مسلمان ہیں جو آباء پرستی کی لعنتوں میں مبتلا ہیں۔ مشائخ اور بزرگوں کی قبریں گوشہ گوشہ میں موجود ہیں اور علانیہ ان کی پوجا ہو رہی ہے۔ ان پر نذریں پیش ہوتی ہیں، قربانیاں کی جاتی ہیں۔ چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ مصائب اور نقصانات کو اصحابِ قبور کی ناراضی پر محمول کیا جاتا ہے اور ان کی زیارت کے لیے لوگ دور دور سفر کر کے جاتے ہیں۔ ان پر مراقبہ کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں اور دوسرے بے شمار محرمات کا ارتکاب کرتے ہیں، جس کا حرام ہونا شریعت میں معلوم ہے۔ تقربِ الٰہی کے لیے ان کا وسیلہ ناگزیر خیال کیا جاتا ہے۔ بہتیرے ان کو سمیع و بصیر خیال کرتے اور خطرات اور مصائب کے وقت ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں[1] ان کو خدا کے ہاں اپنا سفارشی سمجھتے ہیں، ان سے دنیا کی کامیابی، مقدمات میں فتح، تجارت میں فروغ اور آل و اولاد میں برکت مانگتے ہیں۔ ان کی خدمت میں مختلف اغراض و مقاصد کے لیے درخواستیں پیش کی جاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض مزارات پر سائلین کی درخواستوں کے لیے باضابطہ اہتمام ہے۔

کتنی مشرکانہ بدعتیں ہیں جو حضراب صحابہ کرامؓ، صحابیات عظام اور رسولِ اکرم ﷺ اور ازواج و اولاد مطہرات رسولؐ کے نام سے موجود ہیں۔ ان کے نام سے خاص خاص پکوان پکتے ہیں اور ان کے کھانے میں اسی قسم کی تفریقیں ملحوظ ہوتی ہیں، جو مشرکین کے یہاں ملحوظ ہوتی

---

(۱) ایک ثقہ عالم دین دوست راوی ہیں کہ وہ ایک مرتبہ ایک ''اسلامی'' ریاست کے مفتی صاحب کے ساتھ موٹر پر جا رہے تھے۔ سامنے یکا یک ایک بچہ آ گیا۔ مفتی صاحب بے اختیار پکار اٹھے ''یا غوث''۔ انھوں نے دریافت کیا، یہ آپ نے کس غوث کو مدد کے لیے پکارا۔ مفتی صاحب نے فرمایا: شیخ عبدالقادر جیلانی۔

ایک دوسرے بزرگ عالم دین نے ایک مرتبہ ایک عالم دین اور پیشوائے طریقت کے گہرے رنگ تصوف کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے بیان فرمایا کہ ہم اور وہ دونوں ٹم ٹم پر جا رہے تھے۔ راستہ میں گھوڑا بدکا اور ہم دونوں کے لیے سخت خطرہ پیش آ گیا۔ اس وقت بے اختیار انھوں نے یا غوث پکارا۔ راقم نے بر سبیل مدح اس واقعہ کو سن کر اپنے دل میں ان دونوں صاحبوں کی حالت پر اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔

تھیں (1) اور جن کا قرآن نے سورۂ انعام میں ذکر فرمایا ہے۔

کتنے ہیں جو رسول اکرم ﷺ کو ان صفات میں شریک قرار دیتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں۔ حد یہ ہے کہ:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہوکر
اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفیٰ ہوکر

کتنی جگہیں ہیں جہاں نبی کریم ﷺ اور صحابہؓ کے تبرکات بتائے جاتے ہیں اور ان کی زیارت کی تقریبات مستقل فتنہ بنی ہوئی ہیں۔ بعض مقامات پر بزرگوں کی قبروں اور ان کے تبرکات کے صندوقوں یا نبی ﷺ کے نشان قدم کا غسالہ زائرین میں تقسیم ہوتا ہے اور لوگ اس کو بہت سے امراض روحانی وجسمانی کا واحد علاج سمجھ کر پیتے ہیں، آنکھوں میں لگاتے ہیں۔ داڑھیوں میں ملتے ہیں۔ محرم اور تعزیہ داری کی مشرکانہ بدعتیں ہر شہر اور دیہات میں موجود ہیں اور ان کا کم وبیش تجربہ ہر شخص کو ہے۔

کتنے ہیں جو اپنے نسب کو ذریعۂ نجات یا کم از کم ذریعۂ تقرب الٰہی سمجھتے ہیں۔ آباء کا طریقہ کتنوں کے یہاں دین وشرع کی حیثیت رکھتا ہے۔ شرع اور رواج کی اصطلاحیں ہر زبان پر چڑھی ہوئی ہیں اور شرع کے مقابل میں علی الاعلان رواج کو ترجیح دینے والے مسلمانوں کے ہر طبقہ میں موجود ہیں۔

دینی معاملات میں اللہ کی ہدایت کی تلاش اور طلب تقریباً بالکل مفقود ہے۔ مسلمانوں میں مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقہ میں عوام سے گزر کر علماء تک ایسے غالی مل جائیں گے جو اپنے خاص طریقہ، اپنے مخصوص فرقہ کے علما اور اپنے متعین امام پر اس طرح جامد اور ان کی عصبیت میں اس طرح گرفتار ہیں کہ ان کے دائرہ سے باہر ان کے لیے حق وہدایت کا تصور بھی دشوار ہے۔ بعض غالیوں کا تو یہ حال ہے کہ نصوص کتاب وسنت کی قطع وبرید پر پورا زور صرف کر ڈالیں گے، لیکن اپنے امام کے کسی قول پر حرف نہیں آنے دیں گے۔ بعض یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ یہ آیت اور یہ حدیث لازماً ہمارے امام کے سامنے رہی ہوگی لیکن اس کے باوجود جب ان کا فتویٰ

---

(1) مثلاً یہ کہ فلاں نیاز کو مرد نہ کھائیں اور فلاں نیاز فلاں قسم کی عورت نہ کھائے اور فلاں نیاز صرف دن ہی دن میں کھائی جاسکتی ہے اور فلاں نیاز رات کے ہی وقت کھائی جاسکتی ہے۔

یہی ہوا تو ہم ان کی ہی پیروی کریں گے۔ آیت و حدیث کے اسرار سمجھنے کی ذمے داری ان پر ہے۔

کتنے ہیں جو اللہ کے فضل سے دین کا علم بھی رکھتے ہیں لیکن وہ حق کا معیار شیوخ و اکابر ہی کو سمجھتے ہیں۔ ان کے شیوخ جس مسلک پر ہوں اس کا غلط ہونا ان کے نزدیک ناممکن ہے اور جس مسلک پر ان کے شیوخ نہ ہوں اس کی صحت پر کتنے ہی دلائل اللہ کی کتاب سے، رسولؐ کی سنت سے، عقل سے اور نقل سے جمع کر دیجیے، وہ اس سے مطمئن نہیں ہوں گے، جو عصبیت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہونی چاہیے وہ عصبیت ان کے اندر اپنے شیوخ و اکابر کے لیے ہے اور جو حمیت اللہ کی ہدایت اور اس کے رسول کے طریقے کے لیے مطلوب ہے وہ حمیت ان کے اندر اپنے علما اور ائمہ کے طریقے کے لیے ہے اور اچھے خاصے ذہین لوگ بھی اس فتنہ کی اہمیت کو نہیں سمجھتے ہیں۔

اوپر مشرکین کی خود پرستی اور یہود کی قوم پرستی کا بھی ذکر ہوا ہے اور وہاں ہم نے دکھایا ہے کہ ایک متوارث عظمت دینی و دنیاوی کے بعد کس طرح قومیں اور جماعتیں خود طاغوت بن جایا کرتی ہیں۔ کس طرح وہ اللہ کے تمام وعدوں اور اس کی ساری برکتوں کو ایمان باللہ اور عمل صالح کی جگہ اپنے نسب اور خاندان سے وابستہ کر دیتی ہیں۔ کس طرح اپنے دائرہ کو نجات کا دائرہ اور اپنے طریقہ کو ہدی اللہ کا قائم مقام بنا دیتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ سے آپ اسلامی ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کے طریقے سے مطابق ہونا ضروری نہیں۔ یہ جو رنگ ڈھنگ اختیار کر لیں وہ صبغۃ اللہ ہے۔ اگرچہ وہ مغرب کی جاہلی تہذیب کی بھونڈی نقالی ہی کیوں نہ ہو۔ جو تعلیم اپنے بچوں کو دیں وہ اسلامی تعلیم ہے اگرچہ وہ تعلیم بچہ کے دل کے اندر سے اسلام کی جڑ اکھاڑ کر پھینک دے۔ یہ جو ادارے قائم کر دیں وہ اسلامی ہیں اگرچہ ان کے اندر شب و روز اسلام اور اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا ہو۔ جس اساس پر اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کر لیں اور جس شرع و آئین کو بھی اختیار کر لیں ان کی اسلامیت کسی حال میں بھی ان سے جدا نہیں ہوتی۔ ترکی نے پرسنل لا سوئزرلینڈ سے تعزیرات اٹلی سے اور قانون تجارت جرمنی سے مستعار لے لیا تاہم اس کا ایک اہم ترین اسلامی حکومت ہونا مسلّم رہا اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامے انجام پائے وہ دین کے غازی، مجاہد اور محسنِ اعظم سب کچھ سمجھے جاتے ہیں۔

اسی نقطۂ نظر کا غلبہ ہے کہ ہندستان کے مسلمان سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے چند مخصوص دائرے ایسے بنائے جن میں مسلمانوں کی اکثریت حکومت کی مشینری اور مجالس قانون سازی میں حاوی رہی اور اجتماعی اور معاشرتی امور میں انھیں اپنے رنگ کو چمکانے کا موقع ملا تو یہ دائرے پاکستان بن جائیں گے۔ اگرچہ حکومت کا نظام کسی جاہلی نظام کی نقالی ہی ہو، اور اگرچہ نہ مجالس قانون ساز میں اللہ کی کتاب کو کوئی درخور حاصل ہو، اور نہ ثقافتی اور تہذیبی دائروں میں دین کا کوئی دخل ہو یہود اور مشرکین کے ادعائے پاکی و برتری (یزکون انفسھم) کو قرآن نے ان کے اقسامِ شرک میں گنایا تھا۔ اس کی تفسیر حال کے مسلمانوں نے کتنی خوبی کے ساتھ سمجھادی ہے۔ وہ خدا کے محبوبوں کی اولاد اور افضل امت تھے اس لیے سمجھنے لگ گئے تھے کہ وہ جو کچھ کر گزریں وہ آپ سے آپ محبوب و مطبوع ہو جاتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہدی اللہ اور کتاب اللہ کے مطابق بھی ہو، اسی طرح مسلمان سمجھنے لگ گئے ہیں کہ وہ خیر الامم ہیں اس لیے ان کا ہر کام بہتر اور پاک ہے، خواہ اسے شریعت سے کوئی لگاؤ ہو یا نہ ہو۔ وہ جس سرزمین کو اپنا مستقر بنالیں وہ پاک ہے، ان کی اکثریت جو قانون وضع کردے وہ خدا کا قانون ہے، وہ جو پالش مسلمانوں کے چہروں کے لیے تیار کردیں وہ صبغۃ اللہ ہے اور اس راہ میں جو ان کی قیادت کرے وہ قائدِ اعظم ہے۔

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

گویا مسلمان گروہ میں ہونا ہی راہ یاب ہو جانا ہے۔ اگرچہ زندگی خدا سے بغاوت اور نافرمانیوں میں ہی گزرے۔ یہ حلقہ بجائے خود خدا سے نافرمانی کے لیے مامن ہے، جو اس سے باہر ہیں وہ تو دوزخی اور جہنمی ہیں لیکن جو اس کے اندر ہیں وہ عبد کے بجائے طاغوت بن کر بھی خدا کی رحمت کے حق دار ہیں۔ حضرت صادق مصدوق علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ تم اپنے اگلوں (یہود) کے ہر نقش قدم کی پیروی کرو گے۔ غور کیجیے مسلمانوں کی اس ذہنیت اور كُونُوا هُودًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا [1] اور وَلَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً [2] کی ذہنیت میں کیسا حیرت انگیز تشابہ ہے۔

قرآن نے یہود اور منافقین کی طاغوت پرستی اور حمایت شرک کو بھی شرک قرار دیا ہے۔ یہود کی طاغوت پرستی یہ تھی کہ وہ ایسے لیڈروں کی پیروی کرتے، جو اللہ کی ہدایت کی جگہ لوگوں سے

(۱) یہودی یا نصرانی بن جاؤ راہ یاب ہو جاؤ گے۔ (۲) ہم کو تو جہنم کی آگ صرف چند دن چھوئے گی۔

اپنی ہوائے نفس کی پیروی کراتے تھے، مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں کتنے ہیں جو آج ایسے ہی لیڈروں کی پیروی کر رہے ہیں، جو ان سے اپنے ہوائے نفس کی پیروی کرا رہے ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول کی اطاعت کے داعی ہیں نہ ان سے واقف ہیں نہ ان پر عامل ہیں۔ کتنے سادہ لوح ایسے ہیں جو برملا کہتے ہیں کہ ان کا راستہ اللہ اور رسول کا راستہ نہ سہی لیکن ان کے اندر مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ تو ہے۔ طاغوت بننے کی اس سے زیادہ بری مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج مسلمانوں کو اللہ، اس کے دین اور اس کے رسول کی خیر خواہی سے زیادہ خود اپنی خیر خواہی مطلوب ہے۔ اگر ان کی بات بنتی ہے، تو کچھ پرواہ نہیں گر خدا کی بات بگڑ جائے۔ اگر ایک شخص ان کو ایک ایسی راہ پر لے جا رہا ہے، جس میں ان کو اپنے غرور کا سر اونچا نظر آتا ہے تو دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے تو کچھ غم نہیں۔ اللہ اکبر، کیسے شدید فتنہ کا زمانہ ہے کہ مسلمان خدا کی عبدیت سے نکل کر بھی اپنے مسلمان ہونے کا مدعی ہے اور ان لوگوں کو وہ اپنا بہترین خیر خواہ سمجھتا ہے، جو کھلم کھلا اس کو اللہ کے دین کے سوا کسی اور راستے پر لے جا رہے ہیں۔

منافقین کی طاغوت پرستی یہ تھی کہ وہ اپنے بعض معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، اللہ اور اس کے رسول کی عدالت میں نہیں لاتے تھے۔ یہاں یہ حال ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ پر طاغوت کا غلبہ ہے۔ عدالتیں طاغوتی ہیں اور مسلمان ہر طرح کے معاملات میں ان ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ درس گاہیں طاغوتی ہیں اور مسلمانوں کا بڑا طبقہ اپنے بچوں کو ان ہی کے حوالہ کرتا ہے۔ نظام حکومت طاغوتی ہیں اور مسلمان نہ صرف اس کے کل پرزے بنے ہوئے ہیں بلکہ اس کے اندر ترقیِ درجات کے لیے مقابلہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تہذیب طاغوتی ہے اور مسلمان اس غازۂ جمال کو لینے میں بھی سب سے زیادہ مسرف ہیں۔ نظام معاش و معیشت طاغوتی ہے اور مسلمان اس کو اپنانے میں بھی پیش پیش ہے۔ ادب اور آرٹ طاغوتی ہے اور مسلمان اس میں اپنے حصے کے لیے بے قرار ہے۔ اور شاید گنتی کے نفوس ہوں گے جو ان چیزوں کے اندر کوئی قباحت محسوس کرتے ہوں۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ شرک کی حمایت و تائید بھی شرک ہے۔ لیکن یہاں کتنے مسلمان ہیں، جو اپنے ذہن و دماغ اور اعضاء و جوارح کی ساری قوتیں ایک طاغوتی نظام و تمدن کی کامیابی و ترقی میں صرف کر رہے ہیں۔ کتنے ہیں جو اپنے مال سے اس کی سربلندی اور استحکام میں ساعی

ہیں۔ کتنے ہیں، جو اس کلمۂ کفر کے اعلاء کی راہ میں اپنی جانیں تک قربان کر رہے ہیں۔

اسلامی احکام و تعلیمات کے خلاف منافقین کی سرگوشیوں اور اہلِ ایمان کے طریقہ کے خلاف ان کی خود آرائیوں کو بھی قرآن نے شرک قرار دیا ہے لیکن آج کتنے مسلمان ہیں جو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف صرف نجویٰ پر قانع نہیں ہیں بلکہ علانیہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ شریعت کے احکام کو فرسودہ، ناقابل عمل اور خلافِ عقل و تہذیب قرار دیتے ہیں۔ اسلامی تعزیرات اور اسلامی نظامِ معاش و معیشت کو صرف ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے حالات کے لیے سازگار بتاتے ہیں۔ قرآن کی عقلیت کو بہتیرے زمانہ کے معیار سے فروتر سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں، خواہ وہ ظاہر سے متعلق ہو یا باطن سے، اس جادہ سے منحرف ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول نے اہلِ ایمان کے لیے متعین کیا ہے۔ ان کی فکر غیر اسلامی ہے، ان کی معاشرت غیر اسلامی ہے، ان کی تعلیم و تربیت غیر اسلامی ہے۔ ان کا معیار رد و قبول غیر اسلامی ہے۔ جو چیز اللہ و رسول کے ہاں مطلوب و محبوب ہے ان کے ہاں مبغوض و مہجور ہے۔ جو اللہ کے نزدیک مبغوض و مردود ہے وہ ان کے ہاں مطلوب و مقبول ہے۔ انھوں نے یا تو اپنے نفس کو الٰہ بنا رکھا ہے یا ان لوگوں کو الٰہ بنا رکھا ہے، جن کی تعلیم و تہذیب سے وہ مرعوب ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کی نسبت صرف اس قدر ہے کہ وہ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں۔

منافقین کی مفاد پرستی کو بھی شرک قرار دیا گیا ہے۔ آج کتنے مسلمان ہیں، جو اللہ کی بندگی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ بالکل وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ کی تصویر ہیں۔ جس حد تک اسلام کے اقرار اور اس کی پیروی میں کوئی خرخشہ نہیں ہے اس حد تک وہ مسلمان ہیں لیکن جہاں سے اسلام کے وہ مطالبات شروع ہوتے ہیں، جن سے ان کے کسی دنیوی مفاد کو نقصان پہنچتا نظر آتا ہے یا زندگی کو آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہیں سے وہ کٹ کے الگ ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ اور رسول کے حوالہ نہیں کیا ہے وہ رسول کو صرف اعتقاد کی حد تک رسول مان لینا کافی سمجھتے ہیں، اس کی لائی ہوئی تعلیم اور اس کی بخشی ہوئی ہدایت کا زندگی کے ہر شعبہ میں واجب الاطاعت ہونا ان کے نزدیک توحید اور ایمان بالرسالت کا جزو نہیں ہے۔ حالاں کہ ہر رسول اُعْبُدُوا اللّٰهَ (اللہ کی بندگی کرو) کے ساتھ وَ اَطِيْعُوْنِ (اور میری اطاعت کرو) کا بھی حکم دیتا ہے اور یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ جو میرے طریقہ کے خلاف

ہیں ان سے بغاوت کرو: وَلَا تُطِيعُوٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے کفر و اسلام کی اصلی نزاع شروع ہوتی ہے، ورنہ مجرد اس اعتقاد میں کہ اللہ ایک ہے اور رسول اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں، ہم اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے نبیوں اور اس کی کتابوں اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور ایسی کیا بات ہے جس پر گردنیں کٹیں، تلواریں چمکیں اور ہجرت، جہاد اور قتال کے مرحلے پیش آئیں؟ عرب میں آں حضرت ﷺ سے پہلے ایسے لوگ موجود تھے جو بت پرستی کے کھلم کھلا منکر تھے اور ان میں بعض مشہور خطیب بھی تھے جو علانیہ اپنے خطبوں میں توحید کا ذکر کرتے تھے، لیکن قریش کو ان سے کوئی خاص پرخاش نہ تھی۔ پس کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ آں حضرت ﷺ سے مجرد اس بات پر لڑائی کرتے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے ہیں اور بتوں کے مخالف ہیں ان کی ساری لڑائی تو اسی بات پر تھی کہ یہ خدا کی اطاعت کو اس کی بندگی کا ضروری جزو قرار دیتے ہیں اور اس اطاعت کا راستہ اپنی اطاعت بتاتے ہیں اور ہم سے بغاوت اس کی شرط لازم قرار دیتے ہیں۔

دین کا یہی حصہ ہے، جو پرائیویٹ نہیں ہوسکتا اور لازماً اپنے پیروؤں سے اپنی اقامت کے لیے سرفروشی اور جاں بازی کا مطالبہ کرتا ہے۔ چناں چہ یہی وجہ تھی کہ اہل عرب اپنے اندر دینِ حنفی کے پیروؤں کو برداشت کر سکے۔ لیکن آں حضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کو گوارا نہ کر سکے۔ پس جو مسلمان اپنے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کے ساتھ دوسرے دینوں کی اطاعت جمع کر لینے یں شرک کا کوئی شائبہ نہیں پاتے، جن کا دین کوبے میں ایک مسجد اور لندن میں ایک قبرستان سے زیادہ کا طلب گار نہیں ہے، جن کے لا الٰہ کی زد صرف مردہ خداؤں ہی پر پڑتی ہے۔ زندہ خداؤں کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ انھیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ ان کے لیے نہ صرف ہندستان بلکہ تمام دنیا دار الامن ہے۔ ایسی بے دھار کی تلوار سے نہ عرب جاہلیت کو کچھ اندیشہ ہو سکتا تھا نہ جاہلیتِ جدیدہ کو اس سے کوئی اندیشہ ہوسکتا ہے اور اگر جاہل عربوں کو اس سے کچھ چڑ تھی بھی تو موجودہ زمانہ کے متمدن انسان کو اس بے دہانہ کی توپ اور اس ڈائنا بندوق سے کوئی خطرہ نہیں ہے وہ اس بات پر راضی ہے کہ پوجا جس کی چاہے ہوتی رہے۔ البتہ اطاعت صرف اسی کی کی جائے۔

ꕥ

(۷)

وقت کا اصلی فرض اور بعض شبہات کا اِزالہ

جو چیزیں شرک ہیں یا جن چیزوں میں شرک کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی ہے۔ان کے ساتھ ایک مسلمان کا فطری تعلق وصل کا نہیں فصل کا ہے، دوستی کا نہیں دشمنی کا ہے، محبت کا نہیں عداوت کا ہے، حمایت ونصرت کا نہیں نفرت اور بغاوت کا ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ اگر اس کے پاس طاقت ہے تو طاقت سے اس کو مٹا دے۔ اگر طاقت نہیں ہے تو دل میں اس سے بغض ونفرت رکھے۔اس سے نیچے عزم وایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

پچھلی فصل میں مسلمانوں کی جو حالت بیان ہوئی ہے، اس سے واضح ہے کہ ان کی اکثریت کا حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ مسلمان نہ صرف عزم اور ایمان کے آخری درجہ سے گرتے جارہے ہیں، بلکہ ان کے اوپر آہستہ آہستہ شرکیہ اعمال وعقائد کی تہیں جمتی جارہی ہیں۔ اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک مدت سے کسی صحیح دینی نظام کے موجود نہ ہونے اور طاغوت کے غلبہ کی وجہ سے توحید اور اس کے مقتضیات کا صحیح شعور ان میں غائب ہوتا جارہا ہے۔

پس وقت کا اصلی فرض یہ ہے کہ ایک ایسی صالح و مصلح جماعت کھڑی ہو، جو مسلمانوں میں توحید کا صحیح شعور بیدار کرے، جو لوگوں کو عبادت اور عبدیت کا اصلی مفہوم بتائے، جو خدا کی حاکمیت اور رسول کے مطاع ہونے کا لوگوں کو مطلب سمجھائے، جو دنیا پر یہ واضح کردے کہ اسلام اور ایمان کے مقتضیات ولوازم کیا ہیں، جو خدا کی زمین پر اس فرض کو انجام دے، جو بحکم خداوندی كَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا۟ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (1) رسول خاتم ﷺ

---

(۱) اسی طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دو اور رسول تم پر گواہی دے۔

کی امت پر عائد ہوتا ہے، جو خلق خدا کو خدا کی وہ امانت ادا کرے، جس کے ادا نہ کرنے کی وجہ سے یہود ملعون ہوئے لَوۡلَا یَنۡهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا (۱) اور جو اللہ تعالیٰ کے اس منشاء کو پورا کرے، جس کی تکمیل کے لیے اس نے بار بار اپنے انبیاء مبعوث فرمائے اور جس کے لیے کتنی قوموں کو اس نے معزول اور کتنی امتوں کو مامور فرمایا: وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ (۲) یہ جماعت تنہا زبان وقلم سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے خدا کی توحید کی شہادت دے، یہ دنیا کو اللہ کے رنگ میں رنگنے کے لیے اٹھے اور خود اس رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔ قوم و وطن کی ساری عصبتیں اور نسل و خاندان کی ساری بندشیں اس نے توڑ ڈالی ہوں۔ کسی خاص قوم کی سیاسی برتری، عددی اکثریت، اور معاشی فوقیت کی کوئی ادنیٰ خواہش بھی اس کے دل کے کسی گوشہ میں چھپی ہوئی نہ ہو۔ اس کی ساری جدوجہد کا مقصود صرف اللہ کے کلمہ اور اس کے رسولوں کی دعوت کو بلند کرنا ہو۔ اس کی دشمنی دنیا کے کسی ایک ہی باطل سے نہ ہو بلکہ دنیا کے ہر باطل اور زمین کے ہر فساد سے ہو۔ اس کی ضرب بیک وقت ہر جاہل اور طاغوتی نظام پر پڑے، یہاں تک کہ وہ طاغوت بھی اس سے کسی چشم پوشی اور رعایت کا امیدوار نہ ہو، جو اس قوم کے اندر ہو، جس کے اندر سے وہ خود اٹھی ہو۔ وہ باطل کو ایک ایک کر کے الگ کر لے اور حق کا ایک ایک کر کے انتخاب کر لے اور حق کے لیے اپنی دوستی کا اور باطل کے لیے اپنی دشمنی کا اعلان کر دے۔ اس راہ میں اپنی ساری آرزوؤں، ساری تمناؤں، ساری دوستیوں اور تمام رشتوں کو قطع کر لے اور جو کچھ اس کے صلے میں اللہ کے پاس ہے اس پر قانع ہو جائے۔ اس کی دعوت ساری خدائی کے لیے یکساں اور عام ہو۔ اس کی جھولی کی روٹی اور اس کی چھاگل کے پانی میں ہر بھوکے اور پیاسے کے لیے آسودگی اور سیرابی ہو۔ اس کا چراغ پہاڑی کے چراغ کی طرح چمکے اور ہر گم گشتہ راہ کی رہ نمائی کے لیے اشارہ کرے۔ اس کی ہدایت کی ضیا پاشیاں خدا کے سورج کی طرح عام و ہمہ گیر ہوں۔ اس کا ابرِ کرم آسمان کی بارش کی طرح ہر دشت و جبل کو سیراب کرے، اس کی گفتگو ہر بولی میں اور اس کی مخاطب تمام نسلِ انسانی ہو۔ وہ چیخ چیخ کے پکارے اور لپٹ لپٹ کے سمجھائے اور نوعِ انسانی کی روحانی بیماریاں اس کو اس درجہ بے قرار کر دیں کہ وہ خلوت کے

---

(۱) ان کو علما فقہا کیوں نہیں روکتے، جب کہ وہ کتابِ الٰہی کے امین بنائے گئے۔

(۲) اور چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو بھلائی کی دعوت دے۔ معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔

سجدوں میں اس کی نجات کے لیے پھوٹ کر روئے۔ اس کی راتیں بستر کی لذتوں سے محروم ہو جائیں اور اس کے دن فراغت کی گھڑیوں سے بے نصیب ہو جائیں۔ وہ مخلوقِ خدا کی گردن میں اتنے بے شمار اربابِ والہٰ کی غلامی کا بوجھل طوق دیکھ کر دکھ اور درد سے بھر جائے اور ہر سننے والے کان اور ہر دیکھنے والی آنکھ تک اللہ کی وہ دعوت قولاً و عملاً پہنچا دے جو ان تمام مصائب کا واحد علاج ہے۔

ایک ایسی بے ہمہ و باہمہ جماعت اپنے مقصد میں ناکامیاب نہیں ہو سکتی۔ طاغوت کے ہمہ گیر غلبہ کے باوجود انسان کی فطرت مردہ نہیں ہوگئی ہے۔ خدا کے کتنے بندے ایسے ہیں، جن کے دلوں میں توحید اور اس کے لوازم کا شعور آج بھی زندہ ہے لیکن ان کے اندر وہ عزم و ہمت نہیں ہے جو انھیں وقت کے حالات سے پیکار کے لیے بے چین کر دے۔ وہ امرِ حق کو قبول کرنے کے لیے کسی دین و برہان کے منتظر نہیں ہیں۔ ان کو صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ کی آواز بلند کرے اور اپنے عزم راسخ اور حسن نیت سے ان کو یقین دلا دے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہی چاہتا بھی ہے۔ جوں ہی یہ حقیقت ان کے سامنے روشن ہو جائے گی وہ اپنے غفلت کے بستروں کو تہ کر کے اور علائق کی ساری زنجیروں کو توڑ کر اس کے ساتھ ہو لیں گے۔

کتنے ایسے ہیں، جن میں شرک سے پوری پوری بے زاری موجود ہے لیکن توحید کے تمام مقتضیات و لوازم کا ان کو پورا علم نہیں ہے۔ انھوں نے انسان کی عبدیت، خدا کی حاکمیت، رسول کی رسالت اور اسلام و ایمان کا حقیقی مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ مذہب کا مطالعہ تو انھوں نے کیا نہیں ہے یا کیا ہے تو مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ نہیں کیا ہے، اس وجہ سے وہ اپنی موجودہ زندگی کو خدا کے راستہ سے الگ نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو کم از کم اس علیحدگی کی اصلی نوعیت ان کے سامنے نہیں ہے۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگرچہ انھوں نے خدا کے راستہ سے کچھ الگ ہو کر ایک راہ ضرور نکال لی ہے لیکن یہ انفصال ایسا نہیں ہے کہ پھر اتصال ناممکن ہو جائے۔ وہ جوں ہی محسوس کریں گے کہ یہ دو مستقل خط دو مختلف سمتوں میں بڑھ رہے ہیں اور جس قدر آگے بڑھتے جائیں گے ایک دوسرے سے ان کی دوری بڑھتی ہی جائے گی۔ یہاں تک کہ آخرت میں پہنچ کر وہ "اَضَلُّ سَبِیْلاً" کے حکم میں ہو جائیں گے۔ تو وہ فوراً اپنی پوزیشن پر غور

کریں گے اور ان کی بڑی تعداد ان شاء اللہ حق کا ساتھ دے گی۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو حق کو حق سمجھنے میں غبی نہیں ہیں لیکن اپنی مشکلات کا اندازہ کرنے میں غبی واقع ہوئے ہیں۔ وہ صحیح دعوت کے ذریعے سے خدا اور اس کی اعلیٰ صفتوں کا علم جتنا پاتے جائیں گے اپنے نفس کی زنجیروں سے اسی قدر چھوٹتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ان میں اللہ کے کتنے بندے ایسے نکل آئیں گے، جو روح کو جسم پر، ایمان کو پیٹ و تن پر اور خدا اور اس کی بندگی کو دنیا اور اس کی جھوٹی عزتوں اور نمائشوں پر ترجیح دیں گے اور صرف خدا ہی کے راستے میں ان کو سلامتی نظر آئے گی۔ اور جو زیادہ پست ہمت ہوں گے۔ ان میں اہلِ حق کی ایک جماعت کے عملی مظاہرے سے ہمت وقوت پیدا ہوگی، وہ جب دیکھیں گے کہ اس آسمان کے نیچے خدا کے ایسے بندے بھی ہیں جنھوں نے اپنے خالق کی بندگی کی راہ میں جھوٹی عزتوں پر لات ماری ہے، دنیا کو ٹھکرایا ہے، طاغوت سے سرکشی کی ہے، اپنے دنیاوی مفاد اور اپنے اہلِ وعیال کے لیے ہر خطرہ کو دعوت دے دی ہے، تو ان کے ضمیر میں بھی قوت پیدا ہوگی اور وہ بھی اپنے بازوؤں کی قوت اور اپنے پروں کی قوت پرواز کی آزمائش کریں گے۔

چوں کہ اس جماعت پر کسی خاص قومیت کا لیبل چپکا ہوا نہ ہوگا بلکہ اس کا تمام تر رشتہ صرف اللہ کے دین اور اس کے اصولوں سے ہی ہوگا۔ اس لیے خدا کا ہر بندہ اس دعوت پر مجرد اس دعوت کی صفات کے لحاظ سے غور کرے گا۔ اس کو کسی قوم کی عددی اکثریت یا سیاسی برتری کی جدوجہد سمجھ کر اس سے بدگمان نہ ہوگا۔ اور یہ حقیقت جس رفتار کے ساتھ نمایاں ہوتی جائے گی اسی رفتار سے اس دعوت کی مقبولیت بڑھتی جائے گی۔ ایک عیسائی، ایک انگریز، ایک جرمن، ایک اطالوی، ایک ہندو، ایک جین، ایک بدھ سب اس پر مجرد اس پہلو سے غور کریں گے کہ اس دعوت کی عقلی قدر و قیمت کیا ہے، اس کا اخلاقی معیار کیا ہے، معاشی اور سیاسی نقطۂ نظر سے اس کا درجہ کیا ہے، دنیا کے تمام آزمائے ہوئے طریقوں اور دینوی میں اس کو کیا امتیاز حاصل ہے اور کس حد تک یہ دنیا کی مشکلات کا علاج ہے؟ یہ چیز دفعتہً اسلام کو ایک متحرک چیز بنا دے گی اور جو چیز ایک بند تالاب کے پانی کی طرح ساکن و جامد ہے۔ وہ ایک سیلاب کے جوش و طوفان کی طرح ہر پست و بلند پر چھا جائے گی۔

اس جماعت کی دعوت اس مفروضہ سے نہیں شروع ہوگی کہ ہندستان میں ۱۰ کروڑ بنے

بنائے مسلمان موجود ہیں ان کو ۱۲ یا ۱۶ کروڑ کی تعداد تک پہنچانا چاہیے بلکہ وہ ان مسلمانوں کے درمیان ان کے عقائد واعمال کی بنا پر فرق کرے گی۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس کی دعوت یٰاَیُّھَا الْمُشْرِکُوْنَ وَحِّدُوا اللّٰہَ (اے مشرکو اللہ کو ایک مانو) اور یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ (اے کافرو اللہ پر ایمان لاؤ) سے شروع ہوگی۔ جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ اس طریق دعوت سے بالکل ناواقف ہیں، جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے ماخوذ ہے اور جس کی سب سے زیادہ مکمل تصویر خود قرآن پاک میں موجود ہے۔

قرآنی دعوت کے تدریجی مراحل پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جب آں حضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تو باوجودیکہ آپ کی پوری قوم کافر ومشرک تھی لیکن آپ نے دعوت کا آغاز اے کافرو! اور اے مشرکو! کے الفاظ سے نہیں کیا تو پھر ان لوگوں کو جو آپ کے امتی ہیں، ان لوگوں کے اندر جو پشتہا پشت سے مسلمان ہیں اور نہیں معلوم ان میں کتنی عظیم تعداد بندگانِ حق کی ہے، یہ حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ ان کو کافر یا مشرک فرض کرکے اپنی دعوت کا آغاز کریں۔ آں حضرت ﷺ نے دعوتِ حق کا آغاز، اے میری قوم، یا اے لوگو، اے انسانو، سے کیا اور پہلے لوگوں کے اندر ان کے اصولی مسلمات کے مقتضیات ولوازمات کا احساس بیدار کیا۔ اور کفر وشرک کے قبیل کی جو باتیں ان کے اندر پیدا ہوگئی تھیں ان کا کفر وشرک ہونا واضح کیا، یہ کام جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا جاری رہا، یہاں تک کہ قوم پر اللہ کی حجت تمام ہوگئی، جن لوگوں کے اندر صلاحیت قوی تھی وہ رفتہ رفتہ حق کے ساتھ ہوگئے اور جن کے قلوب مردہ ہوگئے تھے یا جن کے حجابات سخت تھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ خود اپنی زبان سے اپنے کفر کا اعلان کردیا۔ بلکہ آں حضرت ﷺ کے قتل کا ارادہ کرلیا اس وقت پیغمبر ﷺ کو ہجرت کا حکم ہوا اور یہ پہلا موقع ہے کہ آپ کی زبان مبارک سے اپنی قوم کے لیے اے کافرو کا لفظ نکلا۔ جو ہجرت وبرأت کی عظیم الشان سورہ قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ میں ہے۔ اس سے پہلے قرآن میں ہم کو آں حضرت ﷺ کی طرف سے اپنی قوم کے لیے یہ خطاب نہیں ملتا۔ اسی طرح مشرکین کا لفظ بھی اہل مکہ کے لیے بالکل ہجرت کے وقت یا اس کے بعد استعمال ہوا ہے۔

علیٰ ہٰذا القیاس اہل کتاب کو جو دعوت دی گئی وہ بھی اے کافرو اور اے مشرکو سے نہیں شروع ہوئی بلکہ اے اہلِ کتاب اور اے لوگوں سے شروع ہوئی اور جب تک ان پر ان کے

مسلمات کے تمام مقتضیات پوری طرح واضح نہیں کر دیے گئے اور نبی اور ایک صالح جماعت کی ایک طویل جدو جہد نے ان کے لیے حق کی توضیح اور اتمامِ حجت کا فرض ادا نہیں کر دیا۔ اس وقت تک نہ ان کے کفر و شرک کا اعلان ہوا اور نہ ان سے جنگ وقتال کی نوبت آئی۔

بالکل یہی معاملہ منافقین کے ساتھ ہوا۔ یہ لوگ اسلام کے تمام اصولوں کے ظاہری طور پر ماننے والے تھے اس لیے قرآن نے ان کو ہمیشہ اے ایمان والو، کہہ کر خطاب کیا اور ان کے سامنے ایمان، اسلام، توحید اور ایمان بالرسالت کے مقتضیات کی تشریح فرمائی، تا کہ جو لوگ غفلت یا جہالت کی وجہ سے غلطیاں کر رہے ہیں، وہ متنبہ ہو جائیں۔ اس کے بعد ان کو دھمکی دی کہ جو لوگ اپنی شرارتوں اور بدعہدیوں سے باز نہ آئیں گے ان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ غزوۂ بدر کے زمانہ سے لے کر غزوۂ تبوک تک ضعفائے قلوب اور منافقین کے بارے میں یہی روش رہی۔ اس بیچ میں اگر کبھی پر جوش مسلمانوں سے اس کا اندیشہ ہوا کہ وہ ان کے بارے میں سختی کی روش اختیار کر لیں گے تو انھیں اس سے روکا گیا۔ قرآن اور احادیث دونوں میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ اس طرح جو لوگ متنبہ ہو گئے اور انھوں نے اپنے معاملہ کی اصلاح کر لی وہ مسلمان اور خادمِ اسلام سمجھے گئے لیکن جو لوگ ان تنبیہات کے بعد بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے ان کا راز طشت از بام کر دیا گیا اور ان کے معاملہ کا فیصلہ کر دیا گیا۔

آں حضرت ﷺ نے یہ طریقہ جو اختیار فرمایا تو یہ محض نفسیاتِ تبلیغ و دعوت کی کوئی جھوٹی نمائش نہیں تھی۔ بلکہ یہ بات ایک نہایت اہم اصل پر مبنی ہے، جس سے لوگ بالعموم اس عہد میں ناواقف ہیں۔ ایک شے اگر کفر یا شرک یا نفاق ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتکب کافر یا مشرک یا منافق ہو جائے۔ ایک حرام شے کا کھانے والا لازماً حرام خور یا فاسق ہی نہیں ہو جاتا۔ ممکن ہے اس کو اس کی حرمت کا علم نہ ہو، ممکن ہے اس کی حالت مجبوری اور اضطراری کی ہو، ممکن ہے وہ تاویل کی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہو۔ ممکن ہے کوئی اور بات ہو۔ بالخصوص انبیاء کے فترۃ کے زمانہ میں ایک ایسی اندھیاری چھا جاتی ہے کہ آنکھ والوں کو بھی راہ سوجھائی نہیں دیتی چہ جائے کہ عوام کالانعام۔ ایسے زمانوں کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو نبی آتا ہے وہ کفر، شرک، یا نفاق کے الگ الگ ٹھپّے لے کر نہیں آتا کہ جس اللہ کے بندے پر جو ٹھپہ چسپاں ہو جائے، اس پر وہ ٹھپہ چسپاں کرتا چلا جائے کہ تو کافر ہے، تو منافق ہے اور تو مشرک ہو گیا ہے بلکہ وہ دین حق کے آثار

اجاگر کرتا ہے۔ اٹے ہوئے نشاناتِ راہ کو نمایاں کرتا ہے۔ بند راہوں کو کھولتا ہے اور ایک مستقل جدوجہد، ایک مسلسل جہاد، اور ایک پاک اور بے داغ زندگی کی بے لوث کارگزاریوں سے حق کو نورِ صبح کی طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ اس جدوجہد سے قوم کے اندر سے صالح الفطرت انسانوں کا عطر کھنچ کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اور ان کا امتیازی وجود حق کے حق ہونے اور باطل کے باطل ہونے کا ایک اور عملی ثبوت ہوتا ہے۔ اس وقت جن کے اندر شعورِ حق کی کچھ بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں کہ خدا کا راستہ یہ ہے اور اس پر چلنا ممکن بھی ہے تب ان لوگوں کے کفر کا فیصلہ ہو جاتا ہے جو اس راہ کو اختیار کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ان کا فیصلہ کر دینے کے لیے یا تو اللہ کا عذاب نمودار ہوتا ہے۔ یا اہلِ حق کی تلوار چمکتی ہے۔ حضراتِ انبیاء کرام کی زندگی سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔

آج جو لوگ تجدید دین واحیائے سنت کے مبارک عزم کے ساتھ اٹھیں گے۔ وہ اسی طریقۂ نبوت سے رہ نمائی حاصل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس امت کو اب کسی نبی کی بعثت کا انتظار نہیں ہے۔ اس کے اندر اقامتِ دین وتجدید دین کا شرعی نظام طریقۂ نبوی پر کام کرنے والی خلافت کا نظام ہے، وہی نظام ہے، جو مسلمانوں کو صحیح راہ پر قائم رکھ سکتا ہے اور پھر وہی نظام ہے جو خلقِ خدا پر اللہ کی حجت تمام کر سکتا ہے۔ لیکن یہ نظام ایک مدت سے درہم برہم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک طاغوتی نظام کا غلبہ وتسلط ہے۔ اس نظام نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو نجس کر دیا ہے۔ کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس طاغوت کی ماتحتی سے آزاد ہو۔ ہمارے اندر سے جو لوگ طوعاً اس کی اطاعت نہیں کر رہے ہیں، انھیں کرہاً اس کی اطاعت کرنی پڑ رہی ہے، متقی سے متقی انسان کا دامن بھی اس کی نجاست کے چھینٹوں سے پاک نہیں ہے۔ دینی تعلیم وتربیت کا سارا نظام معطل ہے۔ جو موجود ہے وہ بھی نظام غالب کی سطوت سے اسی کا خادم وچاکر ہے۔ قلم وزبان کلمۂ حق کے سوا ہر خرافات کے لیے آزاد ہیں۔ دین ومذہب کے نام سے آج جو کچھ لکھا یا سنایا جا رہا ہے اس کا بڑا حصہ موجودہ سوسائٹی اور موجود نظامِ جاہلی کے لیے مذہب کی طرف سے ایک لائسنس ہے۔

ایسے پر آشوب وپرفتن عہد میں اگر مسلمان دین اور اس کے لوازم، توحید اور اس کے مقتضیات سے نا آشنا ہو جائیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔ ایک چمن اگر مالیوں کی نگہداشت سے محروم

ہو گیا ہو یا جو اس کے مالی ہوں ایک مدت سے اس کی صفائی، اس کے درختوں کی کانٹ چھانٹ اس کی خود رَو گھاسوں کے استیصال، اس کے ننھے پودوں کی دیکھ بھال کے بجائے جنگلی گھاسوں اور درختوں ہی کو چمن کے اصلی پودے سمجھ کر ان ہی کو پانی دینے اور ان ہی کی تربیت کرنے لگ گئے ہوں تو اس چمن کا جنگل بن جانا ایک قدرتی بات ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی صحیح مثال یہی ہے۔ وہ ایک قدرتی فرض ہے، جو ایک کسان اپنے کھیت میں، ایک مالی اپنے چمن میں، ایک باغبان اپنے باغ میں، ایک راعی اپنے گلہ میں، ایک ہادی اپنی قوم میں، ایک امت کے ارباب حل وعقد اس امت کے اندر انجام دیتے ہیں اور نظامِ خلافت اسی فرض کی ادائی کے لیے ایک قدرتی اور فطری نظام ہے۔ اس کے بغیر نہ مسلمانوں کا صحیح نہج پر قائم رہنا ممکن ہے اور نہ اس کے بغیر دنیا پر دین کی حجت تمام ہو سکتی ہے، پس آج نہ مسلمانوں کا صراطِ مستقیم سے انحراف قابلِ ملامت ہے نہ خلق خدا کی ضلالت قابل سرزنش ہے۔ مسلمان اس سرزمین کے لیے نمک تھے جب ان کی نمکینی خود جاتی رہی تو اب کوئی چیز نمکین کس چیز سے بنائی جائے گی۔

پس آج جو جماعت مسلمانوں میں توحید اور اس کے مقتضیات کی دعوت کے لیے اٹھے وہ انتہائی حد تک بے رحم ہوگی اگر وہ یہ فرض کر کے اٹھے کہ یہ سارے کے سارے مسلمان کافر و بے دین ہو چکے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرے گی تو اپنے اس طرزِ عمل سے اس بات کا ثبوتِ بہم پہنچائے گی کہ نہ اسے حالات کا صحیح اندازہ ہے اور نہ انبیاء کرام کے طریقِ دعوت سے اسے کوئی مس ہے، کسی کے کفر وفسق کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ کتابِ الٰہی کی اچھی طرح وضاحت کرے اور ایک صالح جماعت کے قیام کے لیے اپنی پوری جدوجہد صرف کر دے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس ظلمت کو دور کر دے، جو ہر طرف چھائی ہوئی ہے اور حق و باطل کا امتیاز ہر طالبِ حق کے لیے آسان ہو جائے۔

تکفیر کا اصلی مفہوم تو یہ ہے کہ کسی شخص کو مرتد قرار دے کر اس کو وہ سزا دی جائے جو اسلام میں ارتداد کے لیے مقرر ہے۔ یہ سزا ایک صالح اور با اختیار جماعت اپنے اندر کے ان افراد کو دیتی ہے، جو اس کی دعوت اور اس کے نظام کے بنیادی اصولوں سے علانیہ اور دیدہ و دانستہ بغاوت کرتے ہیں، اس سزا کے نفاذ کے لیے شرط ہے کہ ایک جماعت موجود ہو جو صالح ہو۔ ایک غیر صالح جماعت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کو غیر صالح قرار دے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ

P-353216

جماعت بااختیار ہو۔ کوئی بے اختیار جماعت تعزیرات وحدود کے اجراء کا حق نہیں رکھتی۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ایک صالح جماعت کے قیام سے ماحول ایسا بن چکا ہو کہ وہ منکرات و معاصی کے لیے سازگار نہ رہ گیا ہو اور خدا کے بندوں پر دین کی حجت تمام کرنے اور حق کی توضیح کے ضروری وسائل برسرکار ہوں بغیر اس کے نہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جاسکتی ہے، نہ زانی کو سنگسار کیا جاسکتا ہے۔ نہ شراب پینے والے کو کوڑے مارے جاسکتے ہیں، یہاں تک کہ اگر ایک صالح و بااختیار جماعت برسر اقتدار بھی ہو اور وقت کی مذہبی فضا بھی ایسی ہو کہ جرائم کے لیے اخلاقی رکاوٹیں موجود ہوں لیکن کسی عارضی سبب سے جرم کے محرکات پیدا ہو جائیں تو اس جرم کی شرعی سزا حکومت جاری نہیں کرے گی۔ چناں چہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑ گیا اور آپ کی انتہائی کوشش کے باوجود ملک کا معاشی توازن قائم نہیں رہ سکا تو آپ نے حالات کی درستگی کے لیے چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ملتوی کردی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے عہد میں ایک عورت زنا کے جرم میں پکڑ کر لائی گئی۔ علمائے یہود نے اس کے سنگسار کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ حضرت نے فرمایا: ہاں اس کو سنگسار کرو مگر اِس کو تم میں سے پہلے وہ شخص پتھر مارے جو خود پاک ہو۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس عہد میں سب زانی ہی زانی ہیں کوئی عفیف اور پاک دامن نہیں رہ گیا ہے بلکہ ان کا اشارہ وقت کی فضا کی طرف تھا کہ اس وقت نہ کوئی صالح جماعت موجود ہے نہ صالح نظام قائم ہے۔ نہ شرعی ماحول ہے۔ اگر یہ عورت اپنے شوہر سے خیانت کی گنہگار ہے۔ تو تم میں سے کون ہے، جو اس سے بڑے گناہ یعنی اپنے خدا سے خیانت اور بے وفائی کا مجرم نہیں ہے۔ تم نے خدا کے عہد کو توڑا ہے اور اس جرم کی سزا میں خدا نے مشرک رومیوں کو تم پر مسلط کردیا ہے تو تمھیں یہ حق کب پہنچتا ہے کہ ایک عورت کو اس کی بے وفائی پر سزا دو۔

پس تکفیر جو ایک سخت ترین سزا ہے، جس کے بعد ایک شخص جماعت سے ہمیشہ کے لیے کٹ جاتا ہے، جس کے بعد وہ واجب القتل مرتد ہو جاتا ہے اس زمانہ میں کسی کو دینا اصولاً غلط ہے۔ اس وقت نہ تو کوئی صالح و بااختیار جماعت موجود ہے اور نہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہ شرعی نظام ہی قائم و زندہ ہے، جو لوگوں کے اندر کفر و شرک کا احساس و امتیاز زندہ رکھے، زندگی کے ہر شعبہ پر طاغوت کی سیاہی چھائی ہوئی ہے اور حق و باطل میں نہ صرف امتیاز معدوم ہے۔

بلکہ باطل کو حق بنا کر چمکانے کی سعی کے لحاظ سے شاید یہ تاریخ کا سب سے زیادہ کامیاب دور ہے۔ ایسے زمانہ میں جو لوگ تکفیر و تفسیق کے کھیل کھیل رہے ہیں وہ وقت کی حالت، تکفیر کی اہمیت اور اس کے شرائط و قواعد سے بالکل بے خبر ہیں اور موجودہ جہل و فساد کی قدرتی پیداوار ہیں۔ اپنے جن بندوں کو اللہ تعالیٰ نے صحیح کام کی طرف توجہ کرنے کی توفیق و ہمت بخشی ہے وہ مسلمانوں کی تکفیر کی فکر میں نہیں ہیں۔ ان کی دعوت کا نقطۂ آغاز یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو حقیقی ایمان لاؤ“ ہے۔

جہاں سب ایک گندے حوض کے اندر گرے ہوئے ہوں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو نجس قرار دے اور اس کو سزا کا مستحق سمجھے۔ صرف گندگی کو گندگی بتانے اور اس سے باہر نکلنے کی جدوجہد کے لیے دعوت دینے کا حق ہے اور یہ کام جاری رہنا چاہیے تا آں کہ جو مسلمان ہندستان کو ایک دار الامن سمجھ کر چین کی نیند سو رہے ہیں، انھیں محسوس ہونے لگ جائے کہ یہ دار الامن نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا مکان ہے، جس میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا ہے یا ایک سنڈاس ہے، جس کے اندر بدبو سے سانس لینا دشوار ہے۔

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

انسان کی فطرت شرک نہیں ہے، جیسا کہ ہم آئندہ فصل میں بیان کریں گے، اور مسلمان تو شرک کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ فطرت جو وقت کی تاریکیوں اور یگانوں بے گانوں کی تھپکیوں اور ان کے انجکشنوں سے ماؤف ہو کر سو رہی ہے بیدار نہ ہو جائے اور انسان خدا کی سچی بندگی کی لذت سے پھر آشنا نہ ہو جائے۔

بعض لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ جب تم ہندستان کو دار الامن نہیں سمجھتے بلکہ دار الکفر والشرک سمجھتے ہو تو تمھیں یا تو یہاں سے ہجرت کر جانا چاہیے یا قتال کرنا چاہیے۔ ان لوگوں کو شاید یہ علم نہیں ہے کہ تبلیغ اور اتمامِ حجت سے پہلے ہجرت اور برأت جائز نہیں ہے۔ بعض انبیائے کرام غیرتِ حق کے جوش میں کامل اتمامِ حجت سے پہلے اپنی قوم کو چھوڑ کر کسی اور جگہ چلے گئے تو ان پر اللہ تعالیٰ کا سخت عتاب ہوا اور انھیں دوبارہ قوم میں تبلیغ و دعوت کے لیے واپس آنا پڑا۔ حضرت یونس علیہ السلام کی سرگزشت اس کی مثال ہے۔

اسی طرح اسلامی جنگ وقتال کے لیے چند بنیادی شرطیں ہیں، جن کا لحاظ کیے بغیر اگر جنگ شروع کردی جائے تو وہ جہاد کے بجائے فساد کے حکم میں داخل ہو جاتی ہے۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ امیر با اقتدار کی قیادت میں ہو، کسی دوسرے نظام قاہر ومسلط کے اندر رہتے ہوئے جہاں کسی با اختیار امیر کا وجود ناممکن ہے، قتال کرنا بدامنی اور فساد ہے، جو جائز نہیں ہے۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے قتال کا اعلان ہجرت کے بعد فرمایا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جو لوگ قتال کے لیے اٹھیں وہ خود شائبہ فساد سے پاک ہو چکے ہوں۔ کیوں کہ اسلامی قتال زمین کے فساد کو مٹانے کے لیے ہے۔ اس وجہ سے کسی ایسی جماعت کا قتال کے لیے اٹھنا ایک بالکل مہمل اور بے معنی بات ہے، جو خود فساد میں مبتلا ہو۔ اسلامی جہاد ہر قسم کی جماعتوں کے ذریعے نہیں کیا جاسکتا، اس کے لیے ایک صالح جماعت کا قیام مقدم ہے۔

پس وقت کا اصلی فرض صرف یہ ہے کہ ایک جماعت اللہ تعالیٰ کے دین کی اقامت کے لیے اٹھے اور مسلمانوں میں صحیح شعورِ دینی پیدا کرے نیز انسانوں کو دین حق کی طرف دعوت عام دے، جس کا پہلا قدم توحید اور اس کے مقتضیات کی تعلیم ہے۔ یہی حضرات انبیائے کرام کا طریقہ رہا ہے۔

☆☆

(۸)

کیا شرک تقاضائے فطرت ہے؟

اس زمانے میں ہر علم وفن کی تحقیق میں اصلی رہنما نظریۂ ارتقا خیال کیا جاتا ہے۔ تاریخ ہو یا قانون، معاشیات ہو یا سیاسیات، فلسفہ و مذہب ہو، یا علم عمران وتمدن ہر ایک کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش کا شوق اس عہد کے ذوق پر اس درجہ غالب ہے کہ اس کے بغیر ہر علم ادھورا اور ناقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہر علم وفن کا مدون سرمایہ، جو پوری روشنی میں موجود ہے، اپنی صحیح قدر وقیمت بنانے کے لیے صرف ناکافی سمجھا جاتا ہے بلکہ اکثر حالات میں وہ بالکل غلط اور مہمل قرار دیا گیا ہے۔ آج اصل شے یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اس عہد میں تحقیق کی جائے جب کہ انسان بالکل حالتِ طفولیت میں تھا اور جس کی کوئی لکھی ہوئی تاریخ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عہد ایک عہد ظلمت ہے۔ اس کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے گا اس کی حیثیت رجماً بالغیب باتوں اور اٹکل کے تیر تکوں سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ اس ظلمات میں خضر راہ ارکیالوجی (علم الآثار) اور بیالوجی (علم الحیات) کے ماہرین سمجھے جاتے ہیں جو زمین کے طبقات، چٹانوں کے پرت، غاروں کے اندر کے آثار وعلامات، گڑی ہوئی ہڈیاں، ابتدائی زمانہ کے آلات واوزار اور قدیم انسان کے کھینچے ہوئے آڑے ترچھے نقوش کو علم کا اصلی سرمایہ قرار دیتے ہیں اور اس پر ظن وتخمین کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔

اس بات کا اعتراف سب کو ہے کہ اس کی حیثیت ظن وتخمین (Guess) سے زیادہ نہیں ہے، تاہم اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ ہر علم وفن میں وہی حقیقت ہے جو ان مظنونات سے ہم آہنگ ہوجائے جو بات ان سے میل نہ پیدا کرسکے وہ بے اصل اور ارتقا کی راہ میں گویا ایک غیر فطری بیرونی مداخلت ہے۔ جس کا وجود نہیں بلکہ عدم مطلوب ہے۔

اس خیال کے غلبہ کا اثر یہ ہوا ہے کہ ایک عرصہ سے دنیا میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے جتنے دعوے ابھرے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو نظریہ ارتقا کا سہارا لینا پڑا ہے اور یہ اتنا مرنجان مرنج واقع ہوا ہے کہ سب کے ساتھ اس کی سازگاری رہی ہے۔ جمہوریت کے حامیوں نے انسان کی ابتدائی سماجی زندگی کا نقشہ اسی طرح پیش کیا ہے کہ جمہوریت ہی کو انسان کا فطری تقاضا ثابت کردیا ہے۔ ملوکیت کے ہمدردوں نے اس کی تقریر اپنے رنگ میں کرڈالی ہے، سماج کے علمبرداروں نے اس کی تصویر اپنے رنگ میں کھینچی ہے، اشتراکیت نے اس کو اپنے رنگ میں پیش کیا ہے، البتہ غریب مذہب اس کو اپنی حمایت میں نہیں استعمال کرسکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ کلیسا سے پہلے ہی مرحلہ میں اس نظریہ کے علمبرداروں سے ان بن ہوگئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے شاطر حامیوں نے شروع ہی سے اس کو ایک مخالف مذہب نظریہ کی شکل دے دی۔ تاکہ اس کو ان مذاہب کی حمایت میں نہ استعمال کیا جاسکے جو اپنے مخصوص انفرادیت کے مدعی ہیں اور جو اپنے عقائد و مسلمات کی بنیاد وحی پر قرار دیتے ہیں، اور دوسرے مذاہب کے ساتھ کسی رواداری کے لیے تیار نہیں ہیں۔ چناں چہ اس نظریہ کی آڑ میں ملاحدہ نے یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی جڑ اکھاڑنے کی پوری کوشش کی اور اس مقصد کے لیے مذہب کے ارتقا کو انھوں نے اس طرح پیش کیا ہے، جس سے آسمانی مذاہب کے تمام مسلمات بالکل ڈھے جاتے ہیں۔

یہاں ہم کو نظریۂ ارتقا کی تمام تفصیلات سے بحث کرنے کا موقع نہیں ہے البتہ ہم اتنے حصہ سے تعرض کریں گے، جس کا تعلق شرک و توحید سے ہے۔

یہ لوگ مذہب کے ارتقا کی تقریر یوں کرتے ہیں کہ مذہب نے انسان کے اولین نقشِ قدم کے ساتھ دنیا میں قدم رکھا۔ جس وقت انسان نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ مجرد ایک جسم نہیں ہے بلکہ اپنے اندر اس سے ایک برتر عنصر روح بھی رکھتا ہے۔ اسی وقت مذہب کی پہلی بنیادی اینٹ رکھ دی گئی اور اس کی ابتدائی تشکیل دو عنصروں سے ہوئی۔ ایک جذبہ خوف، دوسرا تصور۔ خوف اَن دیکھی قوتوں کا جن کے اندر انسان نے اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کیا اور جن کو زور و قوت میں اپنے سے کہیں بڑھ چڑھ کر پایا اور تصور اس بات کا کہ ان کی تعظیم اور بندگی کرنا چاہیے۔

جس طرح ان تمام چیزوں کی تاریخ جو جسم (Body) و جسمانیات سے تعلق رکھتی ہیں

زندگی (Life) کے اس ابتدائی ذرّہ سے وابستہ ہے، جس نے مادہ کو زندگی کی حرکت بخشی ہے۔ اسی طرح ان تمام چیزوں کی تاریخ جو روح و روحانیات سے وابستہ ہیں، اس ذرّۂ روح سے متعلق ہے، جس کے جذبۂ خوف اور تصور کے باہمی تفاعل سے مذہب وجود میں آیا ہے۔ اس مذہبی تصور نے جب مذہبی عمل کی صورتیں اختیار کیں تو اس کے نتیجہ کے طور پر مذہب کے فرائض اور اس کے رسوم و مناسک وجود میں آئے۔ پس مذہب ایک عملِ ارتقا کا نتیجہ ہے۔ وہ زندگی کا ارتقا تھا یہ روح کا ارتقا ہے اور جس طرح یہ بات معلوم ہے کہ زندگی ایک زمانہ میں رینگنے والے جانوروں کی شکلوں (Reptilious Life Forms) میں چھپی ہوئی تھی اور درجہ بدرجہ انسان کی احسن تقویم میں بے نقاب ہوئی، اسی طرح روح ابتدا میں مظاہر پرستی، اشیا پرستی اور سحر و ساحری کی زنجیروں میں گرفتار تھی اور آہستہ آہستہ خالص خدا پرستی تک پہنچی۔

اس تقریر سے جو نتائج یہ علمائے ارتقا نکالتے ہیں وہ بھی ہم اپنے لفظوں میں بیان کیے دیتے ہیں۔

۱- مذہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ ہے۔ یہ خوف مظاہر قدرت سے پیدا ہوا۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، آندھیوں کے شور، آتش فشاں پہاڑوں کے ہولناک نظاروں نے انسان کو ڈرایا اور وہ ان کو زندہ قوتیں سمجھ کر ان کی آفتوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ان کی عبادت کرنے لگا۔

۲- خالص خدا پرستی کے تقاضائے فطرت ہونے کا دعویٰ غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان خدا پرستی کی جگہ مظاہر پرستی اور اشیا پرستی وغیرہ سے مذہب کا آغاز نہ کرتا اور نہ دنیا میں بت پرستی اور مردہ پرستی کی یہ کثرت ہوتی جو ہم تاریخ میں دیکھ رہے ہیں۔

۳- تمام مذاہب کی اصل ایک ہے۔ اس پہلو سے اسلام، اور یہودیت اور افریقہ کے وحشیوں کی سحر پرستی (Magic Worship) میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے تمام مذاہب سے اور تمام عقائد مختلفہ میں رواداری کو اصل الاصول ہونا چاہیے۔

اوپر کی تقریر اس قدر دلکش تھی کہ اس نے ہمارے حال کے بعض علمائے دین کی کتابوں میں بھی جگہ پالی ہے حالاں کہ ہے یہ بالکل مہمل اور غلط۔ عقل و نقل دونوں اس کے خلاف ہیں۔

یہ بات کہ مذہب کا آغاز ان دیکھی قوتوں کے خوف سے ہوا ہے۔ اور یہی جذبہ انسان

کے جذبات میں اولین اور قدیم ترین ہے بالکل بے سروپا ہے۔ انسان میں جو خوف پایا جاتا ہے اس کی اصل حقیقت زوالِ نعمت کا اندیشہ ہے۔ انسان کو اپنی زندگی عزیز ہے۔ زندگی کا سروسامان عزیز ہے۔ اپنے بیوی بچے عزیز ہیں، اس لیے وہ ان چیزوں کی طرف سے اندیشہ میں مبتلا ہوتا ہے کہ کہیں یہ چیزیں اس سے چھن نہ جائیں۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ ان چیزوں کے بارے میں خوف واندیشہ میں مبتلا ہونے سے پہلے ان چیزوں کے نعمت ہونے کا شعور رکھتا ہے اور پھر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ ان نعمتوں کی وجہ سے اس کو ایک منعم کا بھی شعور ہوا ہوگا۔ اور پھر لازماً اس کے لیے شکر گزاری کا جذبہ اور عبادت کا تصور بھی پیدا ہوا ہوگا۔ اس لیے خوف سے پہلے نعمت اور منعم کا شعور ناگزیر ہے جب تک ہمیں زندگی اور اس کے اسباب و وسائل کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو۔ اس وقت تک ہمیں زندگی کے متعلق کوئی خوف نہیں ہوتا۔ چناں چہ جو لوگ اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں وہ موت جیسی خوف ناک چیز سے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔ کتنے آدمی آگ میں کود پڑتے ہیں۔ کتنے دریاؤں اور سمندروں میں ڈوب مرتے ہیں۔ جاپان میں کتنے ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں میں چھلانگ لگا کے ختم ہو جاتے ہیں۔

پس اگر ابتدائی انسان کو بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج اور طوفان کے شور سے کوئی خطرہ محسوس ہوا اور اسے اپنے آپ کو ان کے خطرات سے بچانے کی فکر لاحق ہوئی تو اس سے لازم آتا ہے کہ اسے زندگی اور زندگی کے اسباب و وسائل کے نعمت ہونے کا شعور تھا۔ کیوں کہ جب تک کوئی شے عزیز نہ ہو۔ اس کی حفاظت کی فکر بالکل بے معنی ہے۔ خالی گھر میں کوئی بھی قفل نہیں لگایا کرتا۔ اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اسے ایک منعم کا بھی شعور تھا کیوں کہ نعمت کا وجود ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے اور اگر یہ بات صحیح ہے کہ وہ قدرت کے ان مظاہر کی اس ڈر سے عبادت کرنے لگا کہ وہ اس سے کہیں زندگی کی نعمت یا اس کے اسباب چھین نہ لیں تو اس سے زیادہ صحیح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان نعمتوں کے شعور نے اس کے اندر اپنے منعم کے لیے محبت اور شکر گزاری کا جذبہ بھی پیدا کیا ہوگا۔ پس یہ ثابت ہوا کہ ایک منعم کا شعور، اس کی محبت و شکر گزاری کا جذبہ اور اس کی عبادت کا تصور خوف کے جذبہ اور مظاہرِ قدرت کی عبادت کے تصور پر مقدم ہے۔

بہر حال انسان نے جب سے خوف کا احساس کیا ہے اس سے پہلے زندگی کے نعمت ہونے اور ایک منعم کا اور اس کی محبت کا احساس کیا ہے اور جس وقت اس کے تصور نے اس کو

ورغلایا کہ وہ ان مظاہر قدرت کی عبادت کرے یقیناً اس سے پہلے جذبۂ محبت سے ایک تصور نے ابھر کر اسے اکسایا ہوگا کہ وہ اپنے منعم کا شکر ادا کرے اور محبت اور شکر گزاری کا یہ جذبہ وتصور توحید اور خالص خدا پرستی کی بنیاد رکھتا ہے نہ کہ شرک کی۔ چناں چہ یہی راز ہے کہ قرآن کریم نے حمد وشکر کو انسان کی اوّلین صدائے فطرت بتایا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱)

ہمارے اس نظریہ کی تائید اس امر واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جو چیزیں انسان کے اندر خوف کی حالت پیدا کرتی ہیں وہ دنیا کے عامۃ الورود واقعات میں سے نہیں ہیں۔ زلزلے روز نہیں آیا کرتے۔ آتش فشاں پہاڑ روز نہیں پھٹتے، بجلیاں روز نہیں کڑکتیں، اور طوفانوں کا شور بھی کوئی روزمرہ کا واقعہ نہیں ہے، برعکس اس کے تارے روز چھٹکتے ہیں، سورج روز چمکتا ہے، آسمان کی نیلگونی ہر لمحہ باصرہ نوازی کرتی ہے، چاند روپہلی چاندنی کی چادر دشت وجبل میں روز بچھاتا ہے، ابرِ کرم کی تر دستیاں اور درختوں کی ثمر باریاں ہر موسم میں موجود ہیں۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مظاہر قدرت کی گاہ گاہ کی گھڑکیاں اور دھمکیاں تو انسان کو اس درجہ مرعوب کر دیں کہ وہ ان کی پوجا کرنے لگ جائے لیکن منعم غیب کی یہ ساری فیاضیاں بالکل بے اثر رہ جائیں اور انسان میں شکر وسپاس کا کوئی ولولہ نہ پیدا کریں۔

بیالوجی کے علمانے اس زمانے کی دنیا کی تصویر بہت بھیانک کھینچی ہے اور یہ دکھانا چاہا ہے کہ اس وقت کے قدرتی مظاہر خوف ہی کے جذبہ کا باعث ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ ایک صریحی مغالطہ ہے۔ اس زمانہ کی دنیا اگر بہت بھیانک تھی تو ظاہر ہے کہ اس زمانے کا انسان بھی آج کا انسان نہ تھا۔ اگر اس وقت یہ کائنات اتنی حسین نہ تھی جتنی اب ہے تو اس وقت کا انسان اتنا جمال پرست بھی نہ تھا جتنا وہ اب ہے۔ اگر اس وقت یہ زمین آج کی طرح زرخیز ومعمور نہ تھی تو اس وقت کا انسان بھی آج کی طرح عشرت پسند اور مجلسی نہیں ہوا تھا۔ اگر اس وقت خطرے اور تکلیفیں بہت تھیں تو آج کے انسان کی طرح اس عہد کا انسان نازک بدن اور تن آسان بھی نہ تھا۔ وہ ہر خطرہ سے بچاؤ کے لیے کوسوں بھاگ سکتا تھا، گلہریوں اور بندروں کی سی چستی کے ساتھ درختوں پر چڑھ سکتا تھا۔ آگ جلا کر اور پتے سی کر اپنے جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیف سے بچا سکتا تھا۔ برف باری اور درندوں کی آفتوں سے بچنے کے لیے غاروں میں چھپ سکتا تھا، بھوک میں ہر طرح کے

---

(۱) شکر ہے عالم کے پروردگار کا جو رحمٰن ورحیم ہے

جانداروں کے شکار سے اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ اس لیے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اس وقت کے حالات خوف ہی کے جذبہ کی نشو ونما کے لیے سازگار تھے، اس میں حاضر کو ماضی میں داخل کر دینے کا مغالطہ چھپا ہوا ہے۔ زمانہ تو قدیم ترین دور حجری سے بھی پہلے کا فرض کر لیا گیا ہے اور انسان اس کے اندر اسی بیسویں صدی کا فرض کیا گیا ہے۔

بعض علمائے ارتقا نے خاندان کے بڑے بوڑھے کے خوف کو انسان کے تمام ابتدائی تصورات (Early Thoughts) کی اصل قرار دیا ہے لیکن ہمارے نزدیک خاندان کے بزرگ کا یہ خوف بھی محبت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ بچوں کو تمام لذتیں اور تمام راحتیں ماں باپ سے حاصل ہوتی ہیں، اس وجہ سے وہ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اس محبت ہی کی وجہ سے ان سے ڈرنے لگتے ہیں۔ پس یہ جذبہ بھی اپنی اصل کے لحاظ سے محبت ہی کا جذبہ ہے اور اس سے بلاشبہ ماں باپ کی تعظیم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ بچہ جب تک بچہ رہتا ہے اس وقت تک تو بلاشبہ ساری کائنات باپ ہی کو سمجھتا ہے۔ لیکن جوں ہی وہ خود باپ بنتا ہے یا باپ بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ باپ کا وجود صرف ایک حد تک ہی اس کی لذتوں اور راحتوں کا کفیل ہے۔ اس حد سے باہر قدم رکھنے کے بعد جو کچھ اسے حاصل ہوا ہے اس کا سرچشمہ کوئی اور ہی ان دیکھی ہستی ہے۔ یہاں تک کہ خود باپ کا وجود بھی اسے ان دیکھی ہستی کے بے پایاں بخشائشوں میں سے ایک بخشش معلوم ہونے لگتا ہے۔ پس جس جذبۂ محبت نے اس کے اندر باپ سے محبت، تعظیم اور خوف کی وابستگی پیدا کی ہوگی لازماً اسی جذبہ نے بچپنے کی حدود سے نکلنے کے بعد اس کے اندر ایک ان دیکھی ہستی کے ساتھ محبت، تعظیم اور خوف کی وابستگی بھی پیدا کی ہوگی۔ اگر انسان ہمیشہ دورِ طفولیت ہی میں رہتا تب تو بلاشبہ مذہب پدر پرستی ہی سے شروع ہوتا اور ایذا پرستی ہی پر ختم ہو جاتا۔ لیکن بچہ سیانا بھی ہوتا ہے اور مذہب سیانوں ہی کی ایجاد ہو سکتا ہے تو سیانوں کے اندر اگر باپ کے احسانات کی وجہ سے اس کی تعظیم اور اس کے وقار و احترام کا تصور پیدا ہو سکتا تھا تو اس سے بدرجہا اقرب ہے کہ ان عظیم احسانات کا اثر بھی اسی جذبہ و تصور کی شکل میں ہو، جن میں باپ کو کوئی دخل نہیں تھا لیکن وہ موجود تھے اور باپ سے کہیں بڑھ کر کسی مہر و محبت والی ہستی کے ہو سکتے تھے۔[1]

---

(۱) مذہب کی اصل کے متعلق علمائے ارتقا کے ہاں مقبول عام نظریے یہی دو ہیں اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بہر شکل مذہب کا آغاز خوف کے جذبہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ محبت کے جذبہ سے ہوا ہے اور علمائے ارتقا کے مذکورہ بالا دونوں نظریے باطل ہیں۔ پہلی صورت میں ایک منعمِ حقیقی کے شکر و محبت کا جذبہ اور اس کی عبادت کا تصور مقدم ہے اور غیر اللہ کے خوف کا جذبہ اور اس کی پرستش کا تصور ایک غیر فطری عارض کی طرح انسان کو محض سوءِ فہم اور اپنی فطرت کی صحیح آواز سے غفلت کی وجہ سے لاحق ہو گیا ہے۔ اور دوسری صورت میں یہ ہونا چاہیے کہ انسان باپ کی محبت کا ہاتھ پکڑ کر خدا تک پہنچ جائے۔ اس کے اس جذبہ کا فطری ارتقا اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ باپ سے مستغنی ہونے کے ساتھ ہی مجازی باپ سے حقیقی خالق تک پہنچ جائے اور اس کے ساتھ باپ سے زیادہ محبت کرے اور باپ سے زیادہ اس کی تعظیم بجالائے لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو اس کے معنی یہ ہیں وہ ارتقا کی اصلی شاہراہ پر مارچ کرنے کے بجائے کسی اندھی گلی (Blindalley) میں جا پڑا اور یہ روحانی ارتقا میں اسی طرح کا غیر فطری جمود ہے، جس طرح کے غیر فطری جمود کی مثالیں ہمیں مادّی زندگی کے ارتقا میں ملتی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ قدیم ترین جذبہ والدین کی محبت کا جذبہ اور قدیم ترین تصور والدین کی تعظیم کا تصور ہے، لیکن یہ جذبہ جیسا کہ واضح ہوا بچہ کو بلوغ کے بعد خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ نہ کہ آباء پرستی اور قبائلی دیوتاؤں کی طرف، چناں چہ یہی وجہ ہے کہ قرآن اور توراۃ میں خدا کی عبادت اور والدین کے ساتھ احسان کا حکم ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی فطرت میں خدا اور والدین کے حقوق کا شعور قدیم ترین ہے اور شعور میں والدین کا حق پہلے آتا ہے۔ لیکن درجہ میں خدا کا حق والدین کے حق پر مقدم ہو جاتا ہے، یہ ویسے ہی ہے جیسے بالا خانہ پر چڑھنے سے پہلے زینہ اوپر ہوتا ہے لیکن اس پر پہنچ جانے کے بعد زینہ نیچے ہو جاتا ہے۔ خدا تک پہنچ جانے کے بعد انسان پر یہ راز کھلتا ہے کہ والدین بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہیں۔ ان کو پوجنا تو درکنار اس نعمت کے ملنے پر بھی خدا ہی کا شکر واجب ہے۔ یہی وجہ

ان ہی دونوں کو نسبتاً علمی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے بھی ان ہی دونوں سے تعرض کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بعض نظریات ہیں مثلاً بعضوں نے مذہب کا نقطۂ آغاز طوطمیت (Toteism) کو قرار دیا ہے، بعض نے اس کی اصل اول اول انسان پر کسی نشیلی چیز کے استعمال کے وجد انگیز اثر کو قرار دیا ہے۔ بعضوں نے اس کی بنیاد جنسی خواہشوں پر رکھی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ خرافات محتاج تردید نہیں ہیں۔

ہے کہ اسلام نے والدین کے لیے بیٹے پر تمام حقوق تسلیم کیے لیکن ان کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ بیٹے سے شرک کرائیں۔ (وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا)(۱) اس کا سبب یہ ہے کہ فطرت کے اندر جو داعیہ حقوق والدین کے احترام اور ان کی محبت و تعظیم کے لیے موجود ہے، اس سے قوی تر داعیہ اللہ اور اس کے حقوق کے احترام اور اس کی محبت کے لیے موجود ہے۔ پھر والدین کو یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ جس جذبہ و تصور کی مدد سے وہ ایک چیز پاتے ہیں۔ بعینہٖ اسی جذبہ و تصور کے اس سے قوی تر مقتضیٰ کا خدا کے بارے میں وہ اپنی اولاد سے انکار کرائیں۔

بعض لوگوں کو یہاں ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں جگہ جگہ اہلِ ایمان کی تعریف میں تقویٰ، خشیت اور خوف کا ذکر آیا ہے۔ اس سے علماء ارتقا کی اس بات کی تائید نکلتی ہے کہ مذہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ ہے۔ لیکن یہ شبہ بالکل بے بنیاد ہے۔ اسلام میں وہ خوف و خشیت معتبر نہیں ہے جس کی بنیاد مجرد ضرر رسانی کے اندیشہ پر ہو۔ اس طرح کا خوف چنگیز، تیمور، شیر، ہاتھی، سانپ، بچھو، ہر چیز سے ہو سکتا ہے۔ اس طرح کا خوف اگر خدا سے ہو تو اس کی کیا وقعت ہے؟ مذہب میں جو خوف و تقویٰ مطلوب و محبوب ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس خوف و تقویٰ کی بنیاد محبت پر ہوتی ہے۔ یہ مجرد خدا کے قہر و غضب کے تصور سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کے بے پایاں افضال و عنایات کے تصور اور اس کے اسمائے حسنیٰ کے تذکرے سے پیدا ہوتا ہے۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس کی اعلیٰ صفتوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ وہی لوگ اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور جو اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ وہی اس سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (اللہ سے اس کے بندوں میں سے علما ہی ڈرتے ہیں)۔

ہماری اس بحث سے علماء ارتقا کے اس نظریہ کی پوری تردید ہو گئی کہ مذہب کا آغاز خوف کے جذبہ اور مظاہر پرستی سے ہوا ہے لیکن ایک شبہ یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کی فطرت خالص خدا پرستی ہے اور اس کے روحانی ارتقا کا اصلی رُخ یہی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ دنیا

---

(۱) اگر تجھ سے وہ اس بات پر لڑیں کہ تو کسی ایسے کو میرا شریک ٹھہرائے، جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں ہے تو تو ان کی بات نہ ماننا۔

میں کثرت سے شہادت بت پرستی اور مردہ پرستی وغیرہ ہی کی ملتی ہے؟ تاریخ کے عہدِ ظلمت کے آثار و قرائن بھی اسی بات کی گواہی دیتے ہیں اور جس عہد کا مدوّن سرمایہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے، اس کی شہادت بھی یہی ہے۔ نصاریٰ پر پوری چھ صدیاں بھی نہ گزرنے پائیں کہ ان میں تصویر پرستی رائج ہوگئی حالاں کہ توریت میں اس کی سخت ممانعت تھی، یہود باوجودیکہ توریت کا پہلا حکم توحید تھا، بارہا کھلم کھلا بت پرستی میں مبتلا ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض توحید کے لیے وطن چھوڑا اور ایک سنسان جگہ میں اللہ واحد کی عبادت کے لیے ایک گھر بنایا، لیکن ان ہی کی اولاد نے بہت مدت نہیں گزری کہ اسی گھر میں بتوں کو لا بسایا۔ جب کہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ خالص توحید ہی انسان کی فطرت ہے لیکن واقعات کی شہادت اس کے خلاف ہے تو اس کا جواب دینا ضروری ہے۔ اسی جواب سے علما ارتقا کے اس دوسرے نتیجہ بحث کی تردید ہوگی جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔

یہ بات کہ دنیا میں، ابتدا سے کثرت بت پرستی اور شرک ہی کی رہی ہے اور اب تک ہے اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ شرک و بت پرستی انسان کی فطرت ہے۔ آدمی کا بچہ جب تک بچہ رہتا ہے سامنے کی ہر چیز بلا امتیاز اس کے کہ وہ اینٹ ہے یا پتھر، لکڑی ہے یا لوہا، پاک ہے یا ناپاک، منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ ماں کی چھاتی یہی ہے۔ کچھ دیر تک اس کو چوستا ہے پھر کوئی دوسری چیز اٹھا لیتا ہے، پھر کوئی تیسری چیز اٹھا لیتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ یہ ساری چیزیں بچہ کو فطرتاً مطلوب ہیں محض حماقت ہے، بچہ کی فطری غذا تو ماں کی چھاتی کے اندر ہوتی ہے لیکن چوں کہ اس کو ابھی پورا پورا امتیاز نہیں ہوتا ہے اس وجہ سے وہ ہر چیز کو ماں کی چھاتی ہی خیال کرنے لگتا ہے۔ پس اگر انسان اپنے عہدِ طفولیت میں بت پرستی اور مظاہر پرستی وغیرہ کی نجاستوں میں آلودہ رہا تو اس کے معنی یہ نہیں ہوسکتے کہ یہی اس کی فطرت کا تقاضا تھا بلکہ درحقیقت اس کی یہ ساری پریشانی و سرگردانی معبودِ حقیقی کی تلاش میں تھی اور اسی کی طلب نے اس کو ان تمام کوچوں کی خاک چھنوائی۔ بچہ کی یہ خصوصیت بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بسا اوقات ماں اس کو پکارتی ہے لیکن وہ چیز جس میں وہ مشغول رہتا ہے اسی میں مشغول رہتا ہے، تا آں کہ، وہ اسے گود میں نہ اٹھا لے اور اپنی چھاتی اس کے منہ سے نہ لگا دے۔ پھر جوں ہی اس کو سینہ سے الگ کر دیتی ہے وہ حسب سابق چیز منہ میں ڈالنے اور نگلنے لگ جاتا ہے۔

پس یہ بات بالکل مطابق عقل معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ کے عہدِ ظلمت میں بھی خدا کے ایسے بندے آئے، جو خود بھی بیدار تھے اور جنھوں نے دوسروں کو بھی بیدار کیا لیکن تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد، جیسا کہ بچوں کی فطرت ہے، کھلونوں کی دلچسپی عود کرتی رہی اور انسان کی جستجو اپنا مدعا پاپا کے کھوتی رہی۔

یہاں پہنچ کر بعض لوگوں کو ایک اور شبہ بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ جو چیز انسان کی فطرت ہے چاہیے کہ وہ اسی پر پیدا ہو، اسی پر بڑھے اور اسی پر مرے۔ یہ پاپا کر کھونا اور کھو کھو کے پانا کیا معنی۔ کم از کم یہ تو ہو کہ جستجوئے بسیار کے بعد جب پا جائے تو پھر اسے نہ کھو سکے۔

یہ شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ حیوانات کی جبلت اور انسان کی فطرت کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ حیوانات کی جبلت اپنے بندھے ٹکے قاعدے رکھتی ہے۔ اگر کوئی طبعی خلل نہ واقع ہو تو ان ہی قاعدوں پر ابھرتی، نشو و نما پاتی اور اپنے مقررہ درجۂ کمال تک پہنچتی ہے۔ قدرت نے ان کو اس سے انحراف کرنے، اس کو بدل دینے یا اس میں ترقی کرنے کا کوئی موقع نہیں بخشا ہے۔ وہ اپنے ڈھرے کے پابند اور اپنے طبعی نظام کے اندر جکڑے ہوئے ہیں۔ ایک کبوتر کو آپ گوشت کی دکان کے اندر بند کر دیں تو وہاں وہ بھوکا مر جائے گا۔ لیکن گوشت کے سارے ذخیرے سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ ایک بلی کو اگر آپ پھلوں کی الماری کے اندر بند کر دیں تو وہ بھی بھوکی مر جائے گی۔ لیکن پھلوں کے ذخیرہ سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گی۔ لیکن انسان کی فطرت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ہم انسانی فطرت کی نوعیت واضح کرنے کے لیے استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے الفاظ مستعار لے لیتے ہیں، جو انھوں نے تفسیر سورۂ اخلاص میں مذکورۂ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھے ہیں اور سورۂ روم کی آیات (۴۸-۵۴) کی روشنی میں لکھے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

> ”حکمت اور رحمت کی نشانیاں جو انسان کو تمام عالم میں نظر آ رہی ہیں اور اپنے رب کی طرف کشش جسے وہ مصیبت کے وقت محسوس کرتا ہے، بتا رہی ہیں کہ کسی حاکم مطلق ہستی پر اسے اپنے اندر اور باہر سے گواہی مل رہی ہے ایسی کوئی شہادت بتوں یا مردوں کے لیے نہیں ملتی۔ مگر انسان کی فطرت مثل اور حیوانات کے نہیں وہ غلام بنائے گئے اور اس کو آزادی بخشی گئی جس کا لازمہ تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ترقی کرے۔ پس ان کو جس

ڈگر پر چلانا تھا ہانک دیا اور وہ ایسے ہی چل رہے ہیں مگر انسان کو چراغِ عقل اور توشۂ قابلیت دے کر میدان عالم میں چھوڑ دیا، پس اس کی فطرت میں اس کی قابلیت ہے، جس قدر انسان نے آج تک ترقی کی ہے یہ سب اس کی قابلیت ہی کے آثار ہیں اور اس کی قابلیت ہی کے برگ و بار۔ یہ امر کہ قابلیت کا نام فطرت ہے کچھ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بچۂ طاؤس جو ایک مضغۂ گوشت ہے، جب جوان ہوتا ہے تو اس کے پروں کی گل کاری کو ہم فطرت ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بچۂ انسان جو اکثر جانوروں کے بہ نسبت زیادہ ضعف الجثہ ہے اور اس سے بڑھ کر ضعیف العقل ہے جب اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو کیا اس کی دانائی اور توانائی کو ہم اس کی اعلیٰ فطرت کا نتیجہ نہ سمجھیں! پس انسان اور دیگر چیزوں میں فطرت کے ایک ہی معنی ہیں، البتہ اس کی فطرت میں ایک جداگانہ بات ہے جو اوروں میں نہیں۔ یہ اول میں نہایت کمزور اور بے حقیقت ہوتا ہے مگر آخر میں سب پر فائق ہو جاتا ہے۔ اس کی طاقت کی تھاہ اب تک نہیں ملی۔ مگر یہ سب دو ناتوانیوں کے درمیان ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان سے دعوۂ فرعونی بھی ناموزوں نہ ہوتا، پس محض اس بات سے کہ انسان کی فطرت ترقی کی انتہائی مراحل طے کرتی ہے یہ امر قرین قیاس ہے کہ وہ اکثر غلط راستے پر پڑ جائے پس آزادی رائے اور پھر درازی راہ اس کے حصہ میں آئی۔ ان دو مشکلوں کے ساتھ ایک تیسری مشکل بھی لگ گئی جو ان دونوں سے کبھی جدا ہو ہی نہیں سکتی۔ یعنی انسان نیکی اور بدی کے دوراہہ پر کھڑا کیا گیا جس کے بغیر اس کے حق میں آزادی لفظ بے معنی ہوتی اور ترقی مراتب کے لیے عرصہ تنگ ہوتا۔ پس کوشش اور کشش انسان کی فطرت کا لازمہ ہوا اور نیکی اور بدی کی کشمکش میں آگے بڑھنا اور نفس امارہ اور عقل آوارہ کو جادۂ اطاعت پر لانا اس کا فریضہ ٹھہرا۔"

"انسان کو خدائے تعالیٰ نے ان دقتوں میں ڈال کر اس کی دستگیری کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے اندر اور باہر سامان ہدایت موجود کر دیے ہیں، جس طرح بچۂ ناتواں کے لیے ماں کا آغوش مہیا کیا اسی طرح نوعِ انسان کے لیے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا، جو خدا زمینِ مردہ کو بارش سے سیراب کرتا ہے وہی خدا اپنے کلام سے دلوں کو آباد کرتا ہے، جس طرح وہ بعضے بلند پہاڑوں میں سے قدرتی چشمے نکالتا ہے۔ اسی طرح بعض اعلیٰ دلوں میں سے الٰہی کلمے جاری فرماتا ہے۔ پس اس قدر سامان مہیا کر دینے کے بعد اگر انسان خدا سے روگرداں ہو تو یہ نتیجۂ فطرت نہیں بلکہ اس کی غفلت ہے۔ اگر تاریخ سے

بت پرستی کی مثالیں ملتی ہیں۔ تو اس سے کہیں زیادہ پرزور اس کے ابطال کی مثالیں ملتیں ہیں۔ توحید پر شرک کا غبار آہستہ آہستہ جمتا رہا ہے مگر توحید کا ذرا سا چمکارا شرک کی ظلمت پر غالب ہو جاتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ بدیہی طور پر نکلتا ہے کہ فطرتِ انسانی کو توحید سے مناسبت ہے ورنہ وہ کیوں اس طرف تیزی سے دوڑتا ہے اور دوسری طرف آہستہ آہستہ کھسکتا ہے۔''

اس تقریر سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ انسان کی فطرت اور حیوانات کی جبلت میں چند بنیادی فرق ہیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ فطرت اور اعلیٰ خلقت کے ساتھ آزادی بھی ملی ہے۔ اس آزادی کی وجہ سے وہ اگر چاہے تو احسن تقویم میں ہونے کے باوجود اسفل سافلین کے گڑھے میں گر جائے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کی قوتیں اور قابلیتیں اتھاہ ہیں۔ اس کو ترقی کی ایک لمبی منزل طے کرنی پڑتی ہے۔ حیوانات کی طرح اس کا راستہ کوس دو کوس کا نہیں ہے کہ چلے اور پہنچ گئے۔ اس درازیِ راہ اور آزادیِ راہ کے ساتھ اس کا گرنا اور اٹھنا، ڈوبنا اور اچھلنا بالکل قدرتی بات ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ آزادیِ رائے اور درازیِ منزل کے ساتھ ساتھ اس کی آزمایش بھی کی گئی ہے۔ اس کے سامنے دنیا کو نقد، آخرت کو نسیہ، نیکی کو دشوار اور بدی کو آسان، حرام کو لذیذ اور کثیر اور حلال کو بے مزہ اور قلیل، ثمرۂ حق کو آجل اور نتیجہ باطل کو عاجل، حقیقت کو مستور اور وہم وفریب کو دلکش اور پر جمال بنا کر رکھ دیا ہے۔ تاکہ اس کا امتحان ہو کہ وہ خیر کی طرف لپکتا ہے یا شر کی طرف۔ اپنی فطرت کے مخفی مگر پر حقیقت اشاروں کی طرف بڑھتا ہے یا نفس کی خلافِ فطرت مگر پر فریب دعوتوں کی طرف۔ بلاشبہ یہ امتحان بڑا کڑا ہے لیکن فطرت کا نفسِ لوامہ بھی ضعیف نہیں ہے۔ وہ سخت سے سخت تاریکی کے اندر جھانکنے کی راہ پیدا کر لیتا ہے۔ اور انسان کی رہ نمائی کے لیے اشارے کرتا ہے اور آدمی محسوسات کے کتنے ہی نقاب اپنے اوپر ڈال لے لیکن اس کے اشارے دیکھتا اور اس کی صدائیں سنتا ہے۔ اگرچہ اس کی صدائیں سنتے ہوئے اس کی نافرمانیاں کرتا ہے۔ اور اس کی حجتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے لیے عذرات تلاش کر لیتا ہے۔ یہی حقیقت ہے، جو سورۂ قیامہ کی آیات وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ''اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی'' بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ '' بلکہ انسان چاہتا ہے کہ خدا کے سامنے نافرمانی کرے'' اور بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ

بَصِیۡرَۃٌ وَّلَوۡ اَلۡقٰی مَعَاذِیۡرَہٗ ''انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ کتنے ہی عذرات پیش کرے'' میں بیان ہوئی ہے اور تفصیل اس اجمال کی استاذ امام تفسیر سورۂ قیامہ میں دیکھنی چاہیے۔

امتحان کی یہ سختی اس بات کی متقضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ انسان کی رہ نمائی کے لیے انبیاء مبعوث فرمائے۔ ہرچند فطرت کی کشش خدا کی طرف ضعیف نہیں تھی لیکن دنیا اور اس کی گہرائیاں، نفس اور اس کی فریب کاریاں، شیطان اور اس کی دل ربائیاں بھی اپنے اندر اتنا وزن رکھتی تھیں کہ رحمتِ الٰہی مقتضی ہوئی کہ اس کسر کا جبر مہیا کرے اور نفس کے پہلو پر جو ثقل ہے اس کی تلافی فطرت کے پلڑے میں پاسنگ رکھ کے کردے۔ چناں چہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو شیطان کے ساتھ اس آزمایش گاہ دنیا میں اتارا تو ساتھ ہی اپنی ہدایتیں اور اپنے انبیاء بھیجنے کا وعدہ فرمایا: فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ھُدًی تاکہ اس میدانِ مقابلہ میں انسان کی فطرت تنہا نہ پڑ جائے بلکہ اس کے ساتھ اللہ کے نبیوں، اس کی کتابوں اور اس کے ملائکہ کی نصرت بھی ہو۔ یہ فطرت کی تائید میں مزید ایک کمک مہیا کی گئی، جس کے بعد انسان پر اللہ کی حجت تمام ہوگئی اور اس کے بعد اس کی ہدایت کا معاملہ اتفاق و امکان پر نہیں رہ گیا۔ اب اس کے لیے قیامت کے دن یہ عذر باقی نہیں رہا کہ تاریکی اتنی سخت تھی کہ اس سے اپنی فطرت کے مدھم نقوش پڑھے نہ جاسکے۔ بلاشبہ تاریکی سخت تھی لیکن نورِ مبین اور سراج منیر بھی موجود تھے، جو فطرت کے باریک سے باریک نقوش کو اجاگر کر رہے تھے۔

قدرت کسی گوشے میں بھی اپنی فیض بخشیوں میں بخیل نہیں ہے۔ یہ ممکن تھا کہ انسان کو سننے کے لیے ایک ہی کان دیا جاتا اور دیکھنے کے لیے ایک ہی آنکھ ملتی لیکن قدرت نے دو کان بخشے اور دو آنکھیں عنایت کیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ انسان کی رہ نمائی اس کی فطرت ہی پر چھوڑ دی جاتی لیکن رحمتِ الٰہی نے اس معاملہ کو امکان و اتفاق پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے ہدایت کا بہتر سے بہتر سامان مہیا کردیا۔ اندر اور باہر کی اتنی قوتیں رکھنے کے باوجود اگر انسان خدا پرستی کی حمایت میں شیطان سے لڑنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ بلکہ اس کے ساتھ اس نے سازگاری ہی چاہی تو ظاہر ہے کہ یہ فطرت کی خرابی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اسباب دوسرے ہیں، جو ان شاءاللہ تفصیل کے ساتھ آئندہ فصل میں بیان ہوں گے۔

اس تقریر کے بعد اب اس بات کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ تمام مذاہب کی

اصل ایک ہے۔ اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ نہیں ہے بلکہ محبتِ الٰہی کا جذبہ ہے۔ اور شرک و بت پرستی کی بنیاد ایک بالکل دوسری ہی شے پر ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ پس اسلام (تمام مذاہب حقہ کا اصلی نام اسلام ہے۔ اور یہی ابتدائے آفرینش سے خدا کا اصلی دین ہے) اور شرک و بت پرستی میں اصل و نسل کا فرق ہے۔ اور ان کا قدرتی تعلق صلح و آشتی کا نہیں بلکہ نفرت و عداوت کا ہے۔ ایک فطرت کا ارتقا ہے دوسرا فطرت کی رجعتِ قہقہری۔ دونوں کی سمت سفر اور منزل بالکل مختلف ہے۔ ان میں رواداری اور مسالمت کی گنجائش نہیں ہے۔

دنیا میں انسان محض جینے نہیں آیا ہے۔ اس لیے آیا ہے کہ اس کی فطرت میں جو اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت ہیں۔ ان کو ارتقا کے اس نقطۂ کمال تک پہنچا دے جہاں تک وہ اس عالمِ آب و گل میں رہتے ہوئے پہنچ سکتی ہیں۔ اسی مقصد کے لیے انسان کو دنیا میں جینے کی ایک مہلت ملی ہے۔ اگر یہ مقصد پورا نہ ہو رہا ہو تو اس کا جینا لا حاصل اور اس کا زندہ رکھنا عبث ہے۔ اور قدرت جو ہر گوشے میں اتنی حکیم واقع ہوئی ہے وہ ایک کارِ عبث نہیں کر سکتی۔ انسان کے ارتقائے روحانی کا نقطۂ آغاز جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، خالص خدا پرستی کا جذبہ ہے۔ جب انسان اُس رُخ پر بڑھ چلتا ہے تو وہ ارتقائے فطری کے خلاف بہہ چلا ہے۔ چوں کہ قدرت حد درجہ مہربان ہے۔ اس لیے اس نے فطری ہدایت بخشنے کے ساتھ ساتھ اس کا بھی سامان کیا ہے کہ وہ اپنے انبیا و رسل بھیجتی رہتی ہے جو انسانوں کو ان کے ارتقا کی صحیح سمت میں ہانکتے رہے ہیں یعنی ان کو خالص خدا پرستی کے نقطہ تک لانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

انبیا کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ جس جماعت کے داعی ہوتے ہیں، اس کے نخلِ فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں۔ بہترین سیرت رکھتے ہیں، بہترین کلام سناتے ہیں، بہترین عمل دکھاتے ہیں اور ایک طویل مدت تک اعلیٰ ترین فطرت کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک بہترین جماعت تیار کر دیتے ہیں۔ جو فطری ارتقا کی اصلی شاہراہ پر اپنا مارچ پھر شروع کر دیتی ہے۔ اب اس کے بعد بھی اگر کچھ بلید ایسے ہیں، جن کے کان فطرت کی صداؤں اور نبی کی نداؤں سے بالکل غافل ہیں تو ان کو قدرت کس کام کے لیے باقی رکھے! انسان بنا کے محض جینے، کھانے پینے اور بچے پیدا کرنے کے لیے ان کو رکھ چھوڑا ہے تو بالکل لا حاصل ہے۔

اس کے لیے تو حیوانات موجود ہی ہیں جو یہ سارے کام بھی کر رہے ہیں۔ اور اپنے سے برتر نوع کی خدمت کر کے ارتقا کی شاہراہ پر بڑھ بھی رہے ہیں۔ ان کی ہدایت کے لیے جو جتن کیے جا سکتے تھے وہ کیے جا چکے اب صرف یہ چیز باقی رہ گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے یا تو حقائق کے تمام پردے اٹھادے اور انھیں تمام عالمِ غیب و شہادت کی سیر کرادے یا ہدایت پر مجبور کر دے۔ لیکن یہ اکرام اور کشف حجاب اس آزادی اور اس قانونِ آزمائش کے خلاف ہے، جس کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں تو اب قدرت ان کو کس کام کے لیے جینے کی مہلت دے؟ انسان بجز اس کے اب کیا کرے گا کہ جس غلط راہ پر خود چل پڑا ہے اسی پر ان کو بھی چلائے گا۔ جن پر اس کا قابو چلے گا اور ان کو بھی جو اس کی صلب سے پیدا ہوں گے؟ (اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا) اسی لیے جن قوموں کے اندر انبیا اور رسل بھیجے گئے ان کے بارے میں خدا کا قانون یہ رہا ہے کہ تکمیل دعوت اور اتمامِ حجت کے بعد ان کے صالحین کو چھانٹ کر الگ کر لیا گیا اور ان کے فاسقین و اشرار کو عذابِ الٰہی کے ذریعے سے یا اہلِ حق کے ہاتھوں ختم کر دیا اور بقائے اصلح کا قانون اسی کا مقتضی ہے۔

یہ سنت اللہ انبیا کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے متعین ضوابط ہیں، جو قرآنِ حکیم میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور استاد امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۂ کافرون میں اس پر اجمالی اشارات ملیں گے۔ انبیا کے علاوہ دوسرے اشخاص اور دوسری جماعتیں اس درجہ کا اتمامِ حجت نہیں کر سکتے کہ یہ طے ہو جائے کہ اب اس قوم میں قبولِ ہدایت کی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس لیے ان کو یہ حق نہیں ملا ہے کہ وہ غیر صالح افراد کو ختم کر دیں اِلّا آں کہ ایک شخص نے قبولِ ہدایت کے بعد رجعت وارتداد اختیار کیا ہو۔ کیوں کہ اس کا ایک مرتبہ ہدایت کو قبول کرنا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس پر حق روشن ہو چکا ہے۔ ان کو غیر صالح افراد کے باب میں صرف یہ حق ملا ہے کہ ان کے ہاتھوں سے قیادت کی باگ چھین کر ان کو اپنی ماتحتی میں رکھیں تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلانے کے بجائے ایک صالح قیادت میں رہ کر اور ایک سازگار ماحول میں پل کر، اگر کچھ گنجائش ہے تو اپنی اصلاح کر سکیں۔

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مذہب کا آغاز محبت کے جذبہ سے ہوا ہے۔ جو بچہ کی فطرت میں والدین کے لیے اور بالغوں کی فطرت میں والدین کے سوا منعمِ حقیقی کے لیے

پیدا ہوا۔ اس محبت سے منعمِ حقیقی کے لیے شکر وحمد کا اور والدین کے لیے احسان کا جذبہ پیدا ہوا۔ منعمِ حقیقی کی حمد کے جذبہ نے اللہ کی عبادت کا تصور پیدا کیا، جس نے نماز کی صورت اختیار کی اور والدین کے ساتھ احسان کے جذبہ نے ان کی خدمت اور ان کے لیے انفاق کا تصور پیدا کیا، جس نے ترقی کر کے ایتاءِ ذی القربیٰ اور زکوٰۃ کی شکل اختیار کرلی۔ اس طرح روح انسانی کا ارتقا شروع ہوا۔ حقوق اللہ کی ادائیگی کے تصور نے تمام عقائد وعبادات کو استوار کیا۔ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے تصور نے تمام اخلاق ومعاملات کو استوار کیا۔ یہ فطرت اور خدا پرستی کی صراطِ مستقیم ہے۔ یہی ارتقائے روح کی اصلی شاہراہ ہے۔ اس کے ایک سرے پر ابونا آدم علیہ السلام ہیں اور دوسرے پر خاتم الانبیا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اور اس کے بیچ میں وسط راہ پر خدا کے ہزاروں لاکھوں انبیاء ورسل اور داعیانِ حق تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کھڑے ہیں۔ انھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اسی راہ پر چلنے کی دعوت دی لیکن انسان بار بار اس راہ پر آکر اس سے منحرف ہوتا رہا اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں خرابی پیدا کرتا رہا۔ چناں چہ ہر نبی کو یہ کہنا پڑا کہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا ''زمین کی اصلاح کے بعد اس میں خرابی مت پیدا کرو۔''

☆☆

(۹)

شرک کا اصلی سبب

پچھلی فصل میں یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ انسان کی فطرت کے اندر ایک منعم حقیقی کی محبت اور اس کے حمد و شکر کا جذبہ سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ راسخ ہے۔ چناں چہ اسی بنیاد پر قرآن کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور ہر ابنِ آدم نے بلیٰ کہہ کر اس عہد و اقرار میں شرکت کی ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَ اَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی شَھِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ ۝ (اعراف:۱۷۲)

”اور یاد کرو جب لیا تمھارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور ان کو گواہ ٹھیرایا ان کے اوپر، کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں، بولے ہاں ہم گواہ ہیں۔ یہ اس لیے کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔“

بعض لوگ اس پر شبہ وارد کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے۔ ہمیں نہ تو اس اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے سوال کی کوئی خبر ہے اور نہ یہ یاد ہے کہ ہم نے ”بَلٰی“ کہہ کر کسی عہد کی ذمے داری لی ہے۔ یہ دونوں باتیں محتاجِ ثبوت ہیں۔ بالخصوص جب کہ اس کی اہمیت اس درجہ ہے کہ قیامت کے دن یہ عہد ہر ابن آدم پر حجت ہوگا۔

حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا بات نہیں معلوم ہے؟ ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے۔ ماں نہیں معلوم کتنے مصائب جھیل کر اور کتنے دکھ اٹھا کر نو مہینے

اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے۔ اپنے گوشت وخون سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ پھر جان کی بازی کھیل کر ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں اس کو جنتی ہے۔ پھر اپنے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جانکاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں اور اس کی غور وپرداخت اور تربیت ونگہداشت کا دور آتا ہے، جو ایک طویل عرصے تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے، اس سے زیادہ بچہ کے لیے چاہتا ہے۔ وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ بچہ کو کھلائے۔ وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ بچہ کو آرام پہنچائے۔ وہ خود اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ ہر خطرہ سے محفوظ رہے۔ ماں باپ کی محبتوں، شفقتوں اور جاں بازیوں کا یہ سلسلہ ہے، جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے۔ اگر اس میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے۔ اب فرض کیجیے کہ بچہ جوان ہوا اور والدین بڑھاپے کو پہنچے۔ اب یہ محتاج ہیں اور وہ مستغنی ہے، لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق و فرائض یاد دلاتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے معلوم نہیں ماں باپ کے کچھ حقوق وفرائض بھی ہیں۔ مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمے داری کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے اس قسم کے کسی حق کا اقرار نہیں کیا ہے۔ تو کیا اس کا یہ جواب معقول ہوگا؟ ہر شخص ایک ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا۔ کیوں کہ وہ ایک ایسے حق اور ایک ایسی ذمے داری کا انکار کر رہا ہے، جس سے زیادہ ثابت حق اور مسلم ذمہ داری کوئی اور نہیں ہے۔ یہ ذمے داری ہر استحقاق کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بغیر تحریر کے نوشتہ بغیر گواہی کے ثابت اور بغیر مطالبہ کے مسلم ہے۔ یہ استحقاق (Privilege) اور ذمے داری (Responsibility) کا وہ فطری عہد ہے، جس سے زیادہ انسان پر کسی عہد کی بھی پابندی عائد نہیں ہوتی۔

اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان نفقہ اور حفاظتِ حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے، جس سے متمتع ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر اس آدمی کے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت ونصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک شہر کی میونسپلٹی اپنے شہریوں کی کمائی میں حصہ دار بنتی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعایا سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم وقابلیت، اپنے وقت اور آزادی اور اپنے جان ومال میں اس کو شریک کرے اور اگر سلطنت کا وجود کسی خطرہ میں پڑ

جائے تو رعایا اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کر دے۔

اب فرض کیجیے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک تو بن بیٹھا لیکن اس کے نان و نفقہ کی ذمے داری اور اس کے حقوق و فرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے اس کے حفظان صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے۔ اس کی جلائی ہوئی لالٹینوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے، اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے منتفع تو ہوتا ہے لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں اس قسم کی کوئی ذمے داری نہیں تسلیم کرتا۔ یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے جملہ حقوق سے متمتع تو ہو رہا ہے، اس کے امن و عدل سے فائدہ تو اٹھا رہا ہے، اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ ایک بیوی کا شوہر ایک سلطنت کا شہری تو بنا ہوا ہے لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دے دے کہ میں اس مطالبہ کی ذمے داری سے بری ہوں۔ میں نے اس قسم کے بار اٹھانے اور اس قسم کی جوکھم میں پڑنے کا کبھی اقرار نہیں کیا تھا تو کیا یہ جوابات صحیح ہوں گے؟

بیوی کہے گی یہ عذر غلط ہے۔ جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا اسی دن تو نے ان ساری ذمے داریوں کے لیے مجھ سے ایک میثاقِ غلیظ کیا ہے اور زبانِ خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی۔ یہی جواب ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی جواب ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو اور حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی۔ اور تمام دنیا اس جواب کو بالکل معقول اور ایسے کمینوں کے لیے ہر سزا کو بالکل واجبی قرار دے گی۔ کیوں کہ ہر استحقاق کے ساتھ ذمے داری کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔

اسی استحقاق اور ذمے داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی، ہمارے تھان پر بندھی ہوئی گائے اور گھوڑے ہمارے چمن میں لگے ہوئے پودے اور ہمارے باغ میں اُگے ہوئے درخت کے ہم پر حقوق ہیں اور ہم نہایت لئیم ٹھہریں گے، اگر ان حقوق سے انکار کر دیں، جس مرغی کے انڈے اور چوزے ہم کھاتے ہیں۔ لازم ہے کہ بلیوں اور

کتوں سے اس کی حفاظت کریں، ہم جس گائے کا دودھ پیتے ہیں اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے گھانس اور دانے کے کفیل ہوں۔ ہم جس پودے کے پھول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں۔ ان کو گوڑیں، ان کو کھاد دیں اور سردی کی آفتوں اور لو کی مصیبتوں سے ان کو بچائیں۔ ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کرسکتے، ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت وراحت حاصل کی اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کرلیا۔ یہ استحقاق اور ذمے داری کا عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں از خود واقع ہو جاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں ہے۔

اب غور کیجیے کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار کا حق نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو پیدا کیا ہے۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے، جس نے مرد کی سکینت کے لیے عورت کو وجود بخشا۔ جب ہم خاندان اور قبیلہ، بادشاہ اور سلطنت کے حقوق مانتے ہیں تو وہ جس نے خاندان اور قبیلہ کو وجود بخشا، جس نے بادشاہی اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسان کی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی ان سے کہیں بڑھ کر اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کے عہدِ ربوبیت کا اقرار کریں۔ جب ہم مرغی اور بلی تک کا حق مانتے ہیں، گائے گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدۂ استحقاق اور ذمے داری کا اعتراف کرتے ہیں، تو آخر اس کے عہد سے ہمیں کیوں انکار ہو جس نے گائے اور گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے قیام کے لیے سازگار اور نفع رساں بنایا۔(۱)

پس یہ بات تو بالکل غلط ہے کہ انسان کو اس عہد کا علم نہیں ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اس عہدہ سے عہدہ برآ ہونا ہر بوالہوس کا کام نہیں۔ ہم پچھلی فصل میں بیان کرچکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنی محبت اور اپنی طلب کا جذبہ دے کر اس کی راہ میں خوف اور طمع، رغبت اور

---

(۱) یہاں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ گیتا میں اس شخص کی مثال چور سے دی گئی ہے، جو خدا کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے قربانی کرنے اور اس کے حقوق کے اعتراف سے دریغ کرتا ہے۔

رہبت کے بہت سے عقبات ڈال دیے ہیں تاکہ اس کے اختیار و آزادی کا امتحان ہو اور ہر شخص اپنی ہمت اور قابلیت کے اعتبار سے خدا کے یہاں درجہ اور عزت حاصل کر سکے۔ یہی عقبات ہیں جو ایک طالب صادق اور ایک بوالہوس کے درمیان امتیاز کی کسوٹی ہیں۔ جو اہل ہمت ہوتے ہیں وہ تو ہر پست و بلند اور ہر سہل و صعب کو طے کرتے ہوئے خدا تک پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں نہ راہ کے کسی خطرہ کی پرواہ کرتے ہیں اور نہ کسی طمع کی طرف ملتفت ہوتے ہیں وہ اپنی فطرت کی صدائے جرس برابر سنتے ہیں اور اس کی کشش انھیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ وہ تلوے کے آبلوں اور کانٹوں کی جلن اور چبھن کا خیال کر سکیں۔ لیکن جو پست ہمت اور دنی الفطرت ہوتے ہیں وہ ان عقبات میں سے کسی عقبہ کے پاس ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بس یہی دناءت اور پست ہمتی ہے جو درحقیقت غیر اللہ کی بندگی اور شرک کا اصلی سبب ہے۔ انسان اپنے درجہ اور علوئے منصب کا خیال نہیں کرتا اور جہاں کوئی گھنی چھاؤں یا کوئی خطرہ دیکھتا ہے وہیں کمر کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ دناءت اور پست ہمتی جن گوناگوں شکلوں میں ظاہر ہوئی ہے اور اس نے انسان کو جس جس طرح غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا کیا ہے اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، لیکن ذہن میں اس کا تصور پیدا کرنے کے لیے چند ضروری باتیں یہاں ہم اور کریں گے۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کیجیے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات کے اندر ایک چھوٹی سی بادشاہی بخشی ہے، اس کی وجود کی تقویم اس طرح فرمائی کہ اس کو بہترین قابلیتوں اور بہترین قوتوں سے آراستہ کیا۔ اس کو کھانے پینے، اوڑھنے، پہننے، بیوی بچے، گھر گرہستی کی خواہشیں دیں۔ تاکہ ان خواہشوں کی تحریک سے اپنی بقائے ذات اور بقائے نوع کی قابلیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ اس کو عقل عنایت فرمائی جو خیر و شر میں امتیاز کرنے والی ہے۔ دل عنایت فرمایا، جو بلند ارادوں کا مخزن ہے۔ روح عنایت فرمائی، جس میں اپنی طلب و جستجو ودیعت کی اور ان سب پر اس کو اختیار بخشا کہ وہ ان سب پر حکومت کرے اور ان کو اپنے رب کی رضا کی راہ میں استعمال کر کے خدا کے یہاں سے بلند مرتبہ حاصل کرے لیکن اس نے دیکھا کہ اس کو جتنی چیزیں ملی ہیں ان میں خواہشیں سب سے زیادہ لذیذ ہیں۔ ان کی لذت نقد اور نفع عاجل ہے۔ پس وہ ان کا اس درجہ گرویدہ ہوا کہ اس نے اپنی ساری سلطنت ان کے حوالے کر دی۔ اس نے اپنے حواسِ خمسہ کو حکم دے دیا کہ وہ خواہشوں کی اطاعت کریں اور جو کچھ انھیں مطلوب ہے۔ صرف

اس کی تلاش میں اپنے آپ کو سرگرم رکھیں۔ اس نے عقل کی عدالت معطل کر دی تا کہ ان خواہشوں کے خلاف کوئی مرافعہ نہ ہو سکے۔ اس نے دل کو بھی ان خواہشوں ہی کے تصرف میں دے دیا۔ نتیجہ ہوا کہ بس وہ بطن وفروج کا بندہ بن کے رہ گیا اور اس کی مثال بالکل اس بادشاہ کی ہوگئی جو اپنی کسی لونڈی پر اس درجہ فریفتہ ہو جائے کہ اپنے آپ کو اور اپنی پوری مملکت کو اس کے امر و نہی کے حوالہ کر دے اور اس کی سلطنت کے تمام شرفاء و علماء اور تمام مدبرین ملک و اعضائے سلطنت اس لونڈی کے غلام بن کے رہ جائیں۔ یہ اَفَمَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰاهُ[1] کی صورت ہوئی اور ظاہر ہے کہ یہ انسان کی فطرت نہیں بلکہ اس کی دنائت کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ماں باپ بنائے، بیوی بچے بخشے، خویش و اقارب دیے، کنبہ و خاندان اور قبیلہ و قوم کو جمعیت بخشی، مال و جائداد عنایت فرمائی اور جانوروں کے گلے دیے تا کہ انسان ان کے اندر اور ان کے ذریعے سے اپنی مدنی اور اجتماعی قابلیتوں کو بروئے کار لائے جو اس کے اندر ودیعت ہیں اور اس پر مدینۂ فاضلہ کی تخلیق کرے، جس کا وہ خدا کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے اہل ہے۔ لیکن انسان نے ان سارے وسائلِ مقصد کو اصل مقصد بنا لیا۔ وہ باپ ماں کی محبت میں ایسا مستغرق ہوا کہ اس نے پدر پرستی کی بنیاد ڈال دی۔ بیوی بچوں کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا کہ ان کے لیے خدا اور اس کے حکموں کو بھول گیا۔ کنبہ و خاندان اور قبیلہ و قوم کی عصبیت میں ایسا پھنس گیا کہ ان کے لیے خدا اور اس کے رسولوں کی بغاوت کر دی۔ یہاں تک کہ اس محبت کے غلو میں اس نے آباء پرستی اور قبائلی دیوتاؤں کی پرستش شروع کر دی۔ وہ مال و جائداد کے عشق میں ایسا مبتلا ہوا کہ ان ہی کو معبود خیال کرنے لگا۔ حد یہ ہے کہ جن جانوروں کو اس نے نافع پایا ان کو بھی اس نے دیوتا بنا لیا۔ گائے، بیل، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ سب اسی طرح اس کے دیوتا بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں بطورِ مرکب اسے عنایت کیں تھیں ان کو اس نے راکب بنا لیا اور جو چیزیں بطور کمند کے دی تھیں کہ ان کے سہارے سے خدا تک پہنچ سکے ان کمندوں کو اس نے اپنے پاؤں اور اپنی گردن میں پھندا بنا کر ڈال لیا۔

اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں ایسی بخشیں جو انسان کے لیے یکسر نفع ہی نفع تھیں۔ وہ اپنی نفع رسانیوں کے عوض میں، بیوی بچہ، قوم اور قبیلہ، گائے اور گھوڑے کی طرح آدمی سے کسی

---

(۱) کیا وہ جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔

حق اور ذمے داری کا مطالبہ نہیں کرتی تھیں۔ مثلاً سورج، چاند، ستارے، قوس قزح، ابر، ہوا، آگ پانی، زمین، دریا، پہاڑ، فضا کی چڑیاں وغیرہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے اس لیے عنایت فرمائی تھیں کہ انسان ان کے وجود سے متمتع ہو اور ان کے حقوق کی ذمے داری سے بالکل بے فکر رہ کر اپنے اوقات صرف رضائے مولیٰ کے کاموں میں مشغول رکھ سکے۔ لیکن انسان نے جب دیکھا کہ ہر چیزیں اس قدر نافع ہونے کے باوجود اس سے کسی عوض کی طلب گار نہیں ہیں تو ان کی اس مفت فیض رسانی پر ایسا ریجھا کہ ان میں سے ہر نعمت کو اس نے منعم کا درجہ دے کر اس کی عبادت شروع کر دی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک بادشاہ اپنے کسی مقرب خاص کو بہت سے غلام اور لونڈیاں عنایت کرے اور ان کی ساری ذمے داریاں بھی اپنے سر لے لے تاکہ وہ مقرب خاص اپنی اور اپنے خدام کی ذمے داریوں سے بالکل سبک دوش رہ کر اپنی ساری توجہ صرف سلطنت کے امور مہمہ پر صرف کر سکے، لیکن وہ مقرب خاص ان غلاموں اور لونڈیوں کی ان مفت خدمات پر اس طرح ریجھ جائے کہ ان ہی کو بادشاہ تصور کر کے ان ہی کی بندگی اور اطاعت کرنے لگ جائے اور بادشاہ اور اس کی سلطنت کو بالکل بھول جائے۔

اس طرح بہتوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کی بارش کی، ان کو ملک و مال دیا۔ عزت و رتبہ بخشا، تخت و تاج عنایت کیا تاکہ ان کو آزمائے کہ وہ اس کی بندگی کرتے ہیں یا اس سے بغاوت کرتے ہیں، زمین پر اس کا قانون چلاتے ہیں، یا اپنا قانون چلاتے ہیں۔ امن و عدل پھیلاتے ہیں یا ظلم و فساد پھیلاتے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ سب کچھ ان کے استحقاق و قابلیت کا ثمرہ ہے، تکبر کیا اور بندگی کی جگہ خدائی شروع کر دی۔ کوئی یہ سمجھ بیٹھا کہ ہم خدا کے اوتار ہیں جیسے مصر کے اوتار بادشاہ (God kings) اور ہندستان کے قدیم راجے اپنے آپ کو دیوتا کی حیثیت سے اپنی رعایا سے پجواتے تھے۔ مسلمان بادشاہوں میں سے اکبر کو بھی اس کے جاہل اور خوشامدی درباریوں نے اسی قسم کے خبط میں مبتلا کر دیا تھا۔ کوئی اپنے تئیں آسمانی مخلوق خیال کرنے لگا۔ مثلاً چین و جاپان کے بادشاہ اپنے آپ کو بشریت سے مافوق سمجھتے تھے۔ مصر میں پہنچ کر سکندر بھی اسی مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ان طاغوتوں کی مثال ایسی ہے کہ کوئی بادشاہ اپنے کسی غلام کو کچھ خدم و حشم دے کر اپنی مملکت کے کسی علاقے میں انتظام پر مامور کرے اور وہ غلام خدم و حشم پا کر ایسا مغرور ہو کہ وہاں پہنچ کر اپنی بادشاہی کا علم گاڑ دے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بہتوں کو مال و متاع کی ذمے داریوں سے سبکدوش رکھا اور مقصود اس سے ان کے صبر و رضا کا امتحان تھا کہ دیکھے کہ یہ لوگ طمع دنیا میں پھنس کر خدا کے باغیوں ہی کو معبود بنا لیتے ہیں یا اپنے خشک نوالوں پر قانع رہ کر اپنی فطرت کے عہد پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن بہتیرے اس امتحان میں پورے نہیں اترے اور خدا کی جگہ اس کے باغیوں ہی کے تقرب کے طالب ہوئے اور ان کے لیے بندگی و نیازمندی کی وہ ساری رسمیں بجالائے جو رب کائنات کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں ہوسکتیں۔ ان لوگوں نے خدا کے باغیوں کو ان کی زندگی میں خداوندِ نعمت اور ان داتا وغیرہ بنایا اور مرنے کے بعد ان کے مقبرے، اسٹیچو اور بت تعمیر کرائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بہت سے بندوں پر روحانی برکتیں نازل کیں۔ بعض کو اپنا سفیر و پیغمبر بنایا۔ اللہ کے ان خالص و مخلص بندوں نے کبھی لوگوں کو غیر اللہ کی بندگی کی دعوت نہیں دی لیکن کچھ زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دنیا طلب مریدوں اور ان کی محبت کے جھوٹے مدعیوں نے بیشتر اپنے دنیاوی اغراض کے لیے ان کو لے جا کر خدا کی صف میں بٹھا دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور بہت سے اولیاء و مشائخ اسی طرح خدا کے شریک بنا دیے گئے۔

اسی طرح سیاسی و معاشرتی اغراض بھی اکثر شرک و بت پرستی کے باعث ہوئے۔ قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی قوموں نے دوسری قوموں کے بت محض ان کے ساتھ سیاسی تعلقات استوار رکھنے کے لیے پوجے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ فاتح قوموں نے مفتوح قوموں کی دل جوئی کے لیے ان کے بتوں کو اپنے معبدوں میں جگہ دی۔ ہندستان میں اکبر نے اسی مقصد سے بہت سی خفیف الحرکتیاں کیں۔ قریش نے خانہ کعبہ کو تمام قبائل عرب کے بتوں کا معبد اعظم بنا دیا تا کہ اس طرح تمام قبائلِ عرب پر اپنی سیادت قائم رکھ سکیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی بارہا اس قسم کے رذیل مقاصد کے لیے پڑوس کی مشرک قوموں کے بت پوجے اور یہ تو ان کی تاریخ کی ایک عام حکایت ہے کہ انھوں نے مشرک قوموں کی عورتوں سے شادیاں کیں اور ان کے ساتھ ان کے اصنام اور ان کے مشرکانہ عقائد و رسوم بھی اپنے گھروں میں لائے اور پھر ان عورتوں سے جو اولادیں پیدا ہوئیں وہ بھی لازماً شرک پر اٹھیں۔ مسلمانوں پر انگریزوں اور مغربی قوموں کے غلبہ اور ہندوؤں کے ساتھ اشتراک و

ارتباط کی وجہ سے جو اثرات پڑے پا پڑ رہے ہیں (اور اگر حالات نہ بدلے تو) پڑیں گے وہ ہر واقف حال کے سامنے ہیں۔

یہ چند مثالیں طمع و رغبت کے عقبات کی بیان ہوئی ہیں۔ اب چند مثالیں خوف کی بھی لیجیے۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں جو چیزیں ضرر ناک، خطرناک اور ہول ناک نظر آئیں۔ انسان نے ان کو بھی خدا کی خدائی میں شریک بنالیا۔ انسان اپنی بے اعتدالیوں، اپنی گندگیوں اور اپنی کاہلیوں کے نتیجے میں بیماریوں میں مبتلا کیا گیا تا کہ وہ اعتدال اور پاکیزگی و مستعدی کے اس نقطۂ کمال تک ترقی کرے، جو اس کے احسن تقویم میں پیدا کیے جانے کا مقتضیٰ ہے۔ لیکن انسان کے نفس پر اعتدال کی پابندیاں، صفائی کی احتیاطیں اور مستعدی کی زحمتیں شاق گزریں اور یہ سارے پاپڑ بیلنے کے بجائے اس نے سہولت اس میں دیکھی کہ ان بیماریوں کے اندر روحیں مان کر ان کی دہائی دینے لگا۔ اور ان کی نذریں اور قربانیاں پیش کرنے لگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کسی شخص کو کسی پتھر سے ٹھوکر لگ جائے۔ اور وہ بجائے اس کے کہ آئندہ آنکھیں کھول کر چلنے کا عہد کرے اور جلد بازی سے احتراز کرے، ٹھوکر لگانے والے روڑے کے پاس ایک مندر بنا کے بیٹھ جائے اور اس کے سامنے ڈنڈوت کرنا شروع کر دے۔ یا ایک شخص کے کپڑے میں جوئیں پڑ جائیں اور اس کو ستانے لگیں تو نہانے اور کپڑے دھونے کی زحمت اٹھانے کے بجائے وہ ان کے دفع کرنے کی یہ تدبیر کرے کہ ہر صبح کو ان کی جے پکارنے لگے۔

اسی طرح انسان نے دیکھا کہ سانپ ڈستے ہیں، بچھو ڈنک مارتے ہیں، شیر اور بھیڑیے پھاڑ کھاتے ہیں۔ ان چیزوں کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی جہاں بہت سی حکمتیں ہیں وہاں ایک بہت بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ یہ انسان کو مدنیت، اجتماعیت اور صفائی کی اعلیٰ قابلیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے محرک کا کام دیتی ہے۔ یہ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ جنگلوں کو صاف کر کے میدان بنائے۔ پہاڑوں کو تراش کر گھر بنائے۔ انفرادی زندگی کو ترک کر کے مدنی و اجتماعی زندگی اختیار کرے اور اس کے اندر حفاظت و مدافعت کی جو قابلیتیں پوشیدہ ہیں ان کو فروغ دے۔ اگر یہ درندے اور اژدہے نہ ہوتے تو انسان خود ہی درندوں کے بھٹوں اور اژدہوں کے غاروں میں رہنے والی ایک مخلوق بن جاتا۔ اور مدنیت کے یہ سارے جلوے جو آج

نظر آرہے ہیں ان میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا۔ لیکن جن انسانوں کو یہ ساری تبدیلیاں شاق معلوم ہوئیں اور جس حال میں وہ تھے اسی میں انھوں نے پڑے رہنا چاہا انھوں نے یہ سارے جتن کرنے کے بجائے ان کو جنگل کے دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش شروع کر دی کہ اس طرح ان کو راضی رکھ کر ان کے خطرات سے مامون رہ سکیں گے۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی کاہل الوجود انسان کسی گندی جگہ میں گھر گیا ہو یا کسی دھوئیں بھرے ہوئے مکان کے اندر بند ہو گیا ہو اور اس کی قوت شامہ اور اس کے تنفس کا دباؤ اسے مجبور کر رہا ہو کہ وہ باہر کسی کھلے میدان میں اور تازہ ہوا میں نکلے لیکن اس کی کاہلی اس سے مانع ہو رہی ہو تو وہ غلاظت کے ڈھیر یا دھوئیں کی عبادت شروع کر دے کہ اے غلاظت کی روح! اور دھوئیں کے دیوتا! مجھ پر ترس کھاؤ! تمہاری دہائی ہے۔

اسی طرح قدرت نے جو ہر گوشہ میں نہایت رحیم و مہربان واقع ہوئی ہے کبھی کبھی اپنے عدل و جبروت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے زمین کو ہلا دیا۔ کبھی پہاڑوں سے آگ برسا دی، کبھی ہواؤں کو طوفان بنا دیا، کبھی آسمان سے بجلیاں گرا دیں تاکہ انسان خدا کی رحمت کے غرہ میں اس کے عدل کو بھول نہ بیٹھے بلکہ اس کے قہر و غضب کو بھی یاد رکھے کہ اگر اس میں طغیان پیدا ہوا تو خدا ان ہی چیزوں میں سے جو اس کی نفع رسانی کے لیے ہر وقت سرگرم کار ہیں، جس چیز کو چاہے گا اس کے لیے سرکش بنا دے گا۔ لیکن انسان بجائے اس کے کہ ان تازیانوں کے ڈر سے خدا کی طرف بھاگتا وہ ان تازیانوں ہی کی طرف بھاگا۔ اور جس طرح اس نے نعمتوں کو منعم کی حیثیت دے دی تھی، اسی طرح اس نے نعمتوں کے ان اسباب کو منتقم کا درجہ دے دیا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنی رعیت کو ہر طرح کا امن و چین دے رکھا ہو کبھی کبھی اپنی قوتوں کا مظاہرہ کرے کہ رعایا یاد رکھے کہ جس بادشاہ کے پاس امن و راحت کے یہ سامان ہیں اس کے قبضۂ قدرت میں تادیب و تعذیب کی یہ قوتیں بھی ہیں۔ لیکن رعایا یہ کرے کہ ان قوتوں ہی کو بادشاہ بنا کر ان ہی کی تعظیم و بندگی کرنے لگ جائے اور خود بادشاہ کو نظر انداز کر دے۔

اسی طریقہ پر وہ لوگ بھی معبود بن گئے، جن کی سرکشی اور طغیان کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس لیے مہلت دی کہ وہ اپنی اجلِ مقدر کو پہنچ جائیں۔ نیز ان کے ذریعے سے ان لوگوں کی جانچ ہو سکے جو کسی نوعیت سے ان کے زیر دست ہیں کہ وہ اپنی روح کے عہد پر قائم رہتے ہیں یا اپنے جسم و تن کے مفاد کے لیے ان سرکشوں ہی کے آگے جھک جاتے ہیں اور ان ہی کی ہاں میں

ہاں ملانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس زمرہ میں انسان کے اندر کے سرکش بھی شامل ہیں اور جنات کے اشرار بھی شامل ہیں۔ دنیا کی پوری تاریخ میں ڈھیل اور آزمائش کا یہ قانون نمایاں نظر آتا ہے۔ فرعون، قارون، ہامان، ابولہب، ابوجہل اور ان کے راستوں پر چلنے والے تمام سرکش انسان ایک صف میں ہیں اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور محمد علیہم السلام اور اللہ کے تمام صالح اور مخلص و موحد بندے دوسری صف میں ہیں۔ یہ کش مکش ابتدا سے جاری ہے اور قانونِ الٰہی کے مطابق قیامت تک جاری رہے گی۔ کتنے ہیں جو اپنی روح کے تقاضوں کو جانتے ہوئے کسی طمع یا کسی اندیشہ سے ان جباروں اور طاغوتوں ہی کی عبادت شروع کر دیتے ہیں اور ان ہی کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ لیکن خدا کے کتنے بندے ایسے بھی نکلتے ہیں جو کسی حال میں بھی اپنے خدا اور اپنی روح سے شرمسار نہیں ہوتے اور نہ خود ہی عہد الٰہی پر قائم رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شر کے اس خوف نے شر پرستی کو ایک مستقل دین بنا دیا اور مجوسیوں نے خیر و شر کے دو خدا قرار دے کر دونوں کی پرستش اختیار کر لی۔ ہندوؤں نے دنیاوی سلطنت کے ڈھنگ پر زندگی بخشنے والے، زندگی کی حفاظت کرنے والے اور زندگی لینے والے کی ایک تثلیث قائم کر دی۔ ایران و ہندستان کی قوموں میں زمانہ قدیم سے فلسفہ کا روغن مَل دیا ہے ورنہ غور کیجیے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ ان کے اندر جو شرک پایا جاتا ہے وہ بھی ان ہی راستوں سے آیا ہے، جن راستوں سے دنیا کی دوسری قوموں کے اندر آیا ہے۔ تعجب ہے کہ ان قوموں پر فلسفہ کے غلبہ کے باوجود کائنات کے اضداد کے اندر توافق کا راز واضح نہ ہوسکا حالاں کہ اس کے ہر تضاد کے اندر وہی وحدتِ مقصد مضمر ہے جو زوجین میں نظر آتی ہے اور قرآن نے اس کو گوناگوں شکلوں میں بیان کیا ہے، جس کی تفصیل ''حقیقتِ توحید'' میں بیان ہوئی ہے۔

یہ چند مثالیں محض رہنمائی کے لیے ذکر کی گئی ہیں۔ آپ بت پرستی کی کوئی تاریخ اٹھا کر اس نقطۂ نظر سے پڑھ ڈالیے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ غیر اللہ کی طاعت و عبادت خواہ وہ مردہ خداؤں کی پوجا کی شکل میں ہو۔ یا زندہ خداؤں کی بندگی کی صورت میں نتیجہ ہے صرف انسان کی دنائت کا۔

اسی دنائت ہی کی ایک شکل تقلیدِ اعمیٰ بھی ہے۔ انسان کے ایک بڑے حصہ نے نہ تو کبھی

خود حقیقت پر غور کیا نہ دوسرے غور کرنے والوں اور خدا کے بھیجے ہوئے بندوں کی دعوت پر غور کیا۔ انھوں نے باپ دادا کو جس ڈھرے پر پایا اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہے۔ ان کو یہ کام بڑا مشکل معلوم ہوا کہ باپ دادا کے راستے سے کوئی الگ راہ نکالیں لیکن اگر انسان جانور نہیں ہے بلکہ ایک عاقل اور صاحب اختیار و ارادہ مخلوق ہے تو جانور بن جانا اور اپنی عقل کو معطل کر دینا اس کی دنائت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

دنیا میں بہت سے ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو طریقہ آباء کے اندھے مقلد نہیں تھے بلکہ انھوں نے روش قدیم میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کیں اور اپنے فکر و نظر کے زور سے وقت کے رجحانات کا رُخ پھیر دیا۔ بعضوں نے اس راہ میں بڑی بڑی قربانیاں بھی کیں یہاں تک کہ بعض ہمت وروں نے تو زہر کا پیالہ تک پی لیا بایں ہمہ توحید کا راز ان پر نہ کھل سکا اور وہ ان ہی ضلالتوں میں بھٹکتے رہے ہیں، جن میں ان کی پوری قوم بھٹک رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اکثر ایسے تھے جو بہت سے عقبات طے کرنے کے باوجود قوم پرستی کے عقبہ کو عبور نہ کر سکے اور توحید خالص تک پہنچنے کے لیے یہ شرط ہے کہ آدمی کوئی تسمہ لگا نہ چھوڑے اور یہ سعادت یا تو حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے یا ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ان کی پیروی کی ہمت کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق پائیں۔

اوپر ہم نے شرک کا جو سبب بیان کیا ہے قرآن مجید اور قدیم صحیفوں سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے (اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ)۔ ظلم عدل کی ضد ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی کی حق تلفی کرنا اوپر ہم یہ بات تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ انسان پر سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے۔ پس اس کے حق میں کسی کو ساجھی قرار دینا لازماً سب سے بڑے حق کو تلف کرنا ہے اس وجہ سے یہ ظلم عظیم ہوا اور حق تلفی کا دنائت ہونا بدیہی ہے۔ اور جس درجہ کی حق تلفی ہوگی اسی درجہ کی دنائت بھی ہوگی۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ قدیم صحیفوں میں مشرک کو چھِنال سے تشبیہ دی گئی ہے۔ توریت میں یہ مضمون اکثر بیان ہوتا ہے کہ خداوند غیور ہے، جس طرح تم یہ نہیں پسند کرتے کہ تمھاری بیوی غیر کی بغل میں سوئے اسی طرح وہ نہیں پسند کرتا کہ اس کا بندہ غیر کی بندگی کرے۔ قرآن مجید کی پاکیزگیِ بیان نے اس تشبیہ کو بعینہٖ تو نہیں اختیار کیا ہے۔ لیکن اس کے مفہوم کو نہایت خوبی کے ساتھ لے لیا ہے۔ چناں چہ بعض جگہ قرآن میں مشرک اور زانی اور

مشرکہ اور زانیہ کو ایک ساتھ جمع کیا گیا ہے، مثلاً سورۂ نور میں فرمایا ہے: اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (النور: ۳) (زانی نہ نکاح کرنے پائے مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ سے نہ نکاح کرے مگر کوئی زانی یا مشرک اور مومنوں پر یہ حرام ہے)۔ دو چیزوں کا ایک ساتھ اجتماع بغیر کسی اشتراک کے نہیں ہوا کرتا۔ اس اصل کو سامنے رکھ کر آدمی جب غور کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرک اور چھنال عورت میں نہایت گہری اخلاقی مناسبت ہے۔ چھنال اپنے تئیں ایک مرد کے حبالۂ عقد میں دیتی ہے۔ اس کو اپنی حرمت کا مالک بناتی ہے۔ اس سے نان ونفقہ اور تمام حقوق حاصل کرتی ہے اور پھر اسی کے حق اور اس کی حرمت میں ایک غیر مرد کو شریک کرتی ہے ٹھیک یہی حال ایک مشرک کا ہے۔ وہ خدا سے ربوبیت کا اقرار کرتا ہے بلٰی کہہ کر اس کے ساتھ اپنی بندگی کا عہد باندھتا ہے۔ رہتا اس کے گھر میں ہے، کھانا اس کا کھاتا ہے، پانی اس کا پیتا ہے، کپڑے اس کے دیے ہوئے پہنتا ہے اور اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بندگی غیر کی کرتا ہے۔ محبت کا دم دوسروں کے لیے بھرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت ایک زانیہ کی ہوسکتی ہے۔ یا ایک مشرک کی، روئے زمین پر یہی دو بے وفائیاں ایسی ہیں، جو ایک دوسرے کے لیے مثال بن سکتی ہیں۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ مشرکوں کو قرآن نے خائن بھی کہا ہے اور خیانت عورت کی بے وفائی اور عہد شکنی کے لیے عربی زبان کا ایک مشہور لفظ ہے۔

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہوگیا کہ قرآن مجید میں کیوں بار بار یہ بات آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری خطاؤں کو جس کے لیے چاہے گا معاف کردے گا۔ مگر شرک نہیں معاف فرمائے گا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک شریف اور غیور شوہر اپنی بیوی کی ہر غلطی معاف کرسکتا ہے لیکن اس کی بے وفائی کو کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہ شوہر نہیں ہے۔ بلکہ ایک دیوث، کمینہ، لئیم اور بے غیرت جانور ہے۔ جب انسان کی غیرت کا یہ عالم ہے تو پھر اس کی غیرت کا تصور کون کرسکتا ہے، جس کے جمالِ غیرت کے ایک ادنیٰ پرتو سے یہ تمام عالم جمال عفت وحمیت سے نورانی ہوا۔ وہ اس بندہ کو کیسے معاف کرسکتا ہے، جس نے غیر کی بندگی کا داغ اپنے دامن پر لیا ہے۔ چناں چہ فرمایا ہے اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ○ (وہ عزیز، جبار اور غیور ہے، پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھیراتے ہیں) اس آیت کے اسمائے حسنیٰ میں سے

خصوصیت کے ساتھ متکبر کی صفت پر غور کرنا چاہیے اور پھر اس بات کو دیکھنا چاہیے کہ اس کے ساتھ ہی کس طرح شرکاء اور مرسروں سے اپنا پاک و برتر ہونا بیان کیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو متکبر اور غیور ہے اور جس کے سوا کسی کے لیے بھی کبریائی زیبا نہیں ہے اس کی غیرت و کبریائی کبھی کسی شریک کو گوارا نہیں کرسکتی۔

زنا اور شرک کی اس مشابہت کی وجہ سے شرک کو جگہ جگہ رِجس (ناپاکی) کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور مشرکوں کو نجس بھی کہا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان خائنوں سے جو اس ناپاکی سے آلودہ ہیں اپنے حرم کو پاک کرنے کا حکم دیا ہے کہ وہ خدا اپنے حرم میں بے وفاؤں کی موجودگی گوارا نہیں کرسکتا۔ اور یہ قانونِ الٰہی مقرر ہے کہ جو جماعت اس نجاست میں آلودہ ہوجاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کی زد میں آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ شرک کی اصلی حقیقت سے واقف ہیں وہ پہلے سے اس قوم کی موت کا فیصلہ کردیتے ہیں، جو شرک کے جراثیم قبول کرلیتی ہے۔ چناں چہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم پر یہ نجاست اور خدا کا غضب دونوں بیک وقت نازل ہوتے ہیں۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ۖ أَتُجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ۝ (الاعراف: ۷۱)

”کہا تم پر تمھارے رب کی طرف سے رجس اور غضب نازل ہوچکا ہے کیا تم مجھ سے چند ناموں کے بارے میں جھگڑ رہے ہو۔ جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے ٹھیرا لیے ہیں اور جن کی کوئی دلیل اللہ نے نہیں اتاری؟ تو تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں۔“

شرک سے خدا کے حقوق جس طرح تلف ہوتے ہیں یہ بالاجمال اس کا بیان تھا۔ اب اس پہلو پر غور کیجیے کہ شرک خود اپنے نفس پر بھی سب سے بڑا ظلم ہے اور اس اعتبار سے بھی یہ دنائت اور رَذالت ہی ہے۔

اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عزت بخشی ہے اور اس کو جو قوتیں اور قابلیتیں عنایت کی ہیں اگر وہ دو ناتوانیوں یعنی بچپن اور بڑھاپے کی بیچارگیوں کے درمیان گھری ہوئی نہ ہوتیں تو اس کے لیے دعوئے فرعونی بھی ناموزوں نہ ہوتا۔ اس کی طبیعت کی بلندی اور تمام

کائنات پر اس کے شرف وفضیلت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ کسی کی بندگی کرنے کے بجائے خود معبود بننے کا خواہش مند ہوتا لیکن ان تمام عظمتوں کے باوجود جب وہ دیکھتا ہے کہ نہ میں خود اپنے آپ کو اس دنیا میں لایا ہوں نہ یہاں اپنے آپ کو رکھنے پر قادر ہوں اور نہ میں نے آسمان وزمین اور ان کے درمیان کسی چیز کو بنایا ہے نہ ایک مکھی یا بھنگے کے بنا سکنے کی بھی مجھے قوت حاصل ہے تو وہ ضعف وعجز کے تذلل اور شکر وسپاس کے خشوع کے ساتھ ایک ان دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دیتا ہے اور یہ وہ اس لیے کرتا ہے کہ ایسا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اس کے بغیر نہ اس کی عقل مطمئن ہوتی ہے، نہ اس کے دل کو چین نصیب ہوتا ہے، نہ اس کائنات کا معمہ ہی حل ہوتا ہے۔ یہ کر چکنے کے بعد جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے اس کے دل کی ساری پریشانیاں اور عقل کی ساری الجھنیں دور ہو جاتی ہیں اور کائنات کے اسرار کو حل کرنے کے لیے وہ سرا مل جاتا ہے، جس سے ساری گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جن کے آگے سر جھکانا ہے تو اس کا بار ثبوت اس شخص کے ذمے ہے، وہ تو یہ کہہ کر الگ ہو جائے گا کہ نفس کی بلندی نے یہ ایک کے آگے پست ہونا اس لیے گوارا کر لیا کہ اس کے بغیر پناہ نہیں تھی۔ اور اس کے بارے میں ہم اور تم دونوں متفق ہیں۔ باقی اس کے علاوہ جن کا تم ذکر کرتے ہو ان کی دلیل تم خود لاؤ مجھے خواہ مخواہ بہت سے خدا بنانے کا شوق نہیں ہے۔ میرے لیے تو ایک ہی رب ومولیٰ ہے۔ جب کوئی غلام یہ نہیں پسند کرتا کہ کئی آقاؤں کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے تو میں یہ ذلت ودنائت کیوں گوارا کروں کہ بہت سے ارباب کا بندہ بنوں: ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ (یوسف:۳۹)

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلاً فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلاً ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (الزمر:۲۹)

"اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ ایک شخص تو وہ ہے، جس کے مالک ہونے میں بہت سے کج خلق آقا شریک ہیں، جو اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟ الحمد للہ، مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔"

لیکن جو دنی الفطرت تھے انھوں نے اپنے نفس کی کوئی قدر نہیں کی اور خدا کی خلافت کا رُتبہ پاکر انھوں نے اپنے حقیر سے حقیر خادموں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا رب بنایا اور اپنے نفس کی وہ اہانت کی، جس سے بڑی کوئی اہانت نہیں ہو سکتی۔ وَ مَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ اور وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ میں اسی رذالت و دنائت کی طرف اشارہ ہے۔

عقیدۂ توحید کو عام انسانی ذہنوں میں جاگزیں کرنے والی

ہماری اہم مطبوعات

الاسماء الحسنیٰ	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
کلمۂ طیبہ کے معنیٰ	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
خدا کی اطاعت کس لیے؟ [پاکٹ سائز]	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
توحید اور شرک	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
توحید ورسالت کا عقلی ثبوت	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
بدعت توحید کی ضد ہے	مولانا عامر عثمانیؒ
حقیقتِ شرک	مولانا امین احسن اصلاحیؒ
حقیقتِ توحید	مولانا امین احسن اصلاحیؒ
حقیقتِ عبودیت	امام ابن تیمیہؒ
اسلامی توحید	مولانا محمد یوسف اصلاحی
خدا کی غلامی۔ انسان کی معراج	مولانا سید جلال الدین عمری
توحید اور مسائل حیات	محمد فاروق خاں
خدا کا تصور ہندو دھرم کی کتابوں میں	محمد فاروق خاں
توحید آئینۂ ذات وکائنات میں	محمد فاروق خاں
خدا موجود ہے	جان کلور مونزما

₹114.00

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

M.M.I PUBLISHERS

D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar
New Delhi-110025, Ph.: 26981652, 26984347
Email: mmipublishers@gmail.com, info@mmipublishers.net
Web: www.mmipublishers.net
Customer Care No: 7290092403

PN-529